D. L. NO. 7243

PHONE : 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

دسمبر 1970ء

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵- بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

ٹیلیفون	قیمت فی پرچہ	بدلِ اشتراک
۸۰۸۰۰	پاکستان ــــــ ایک روپیہ	سالانہ ــ پاکستان ــ دس روپے
خط و کتابت	ہندوستان	سالانہ ــ ہندوستان ــ پندرہ روپے
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی گلبرگ ۲ لاہور	ڈیڑھ روپیہ	سالانہ ــ غیر ممالک ــ ایک پونڈ

نمبر (۱۲)	دسمبر ۱۹۷۰ء	جلد (۲۳)

فہرست

لمعات ــــــ ۲

روئداد طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۰ء ــــ (محترم غلام صابر صاحب) ــــ ۱۷

استقبالیہ ــــ (ظفر احسن محمود صاحب) ــــ ۳۸

طلوعِ اسلام کالج ــــ (سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی) ــــ ۴۱

پرویز صاحب کی پریس کانفرنس ــــ ۴۵

باب المراسلات ــــ ۵۰

حقائق و عبر ــــ ۵۸

پیپلز پارٹی کا انتخابی منشور (قرآن کے آئینے میں) ــــ ۶۳

تحریک طلوعِ اسلام کا تعارف ــــ (محترم محمد اسلام صاحب) ــــ ۷۳

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: سراج الحق، مقام اشاعت: ۲۵-بی، گلبرگ، لاہور، پرنٹر: شیخ محمد اشرف، مطبوعہ: اشرف پریس ایبک روڈ لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لمعات

جشنِ نزولِ قرآن

دنیا کی ہر قوم سال میں کوئی نہ کوئی دن بطور تہوار ضرور مناتی ہے۔ ان کے یہ تہوار، قومی ہوتے ہیں یا وطنی، گروہی ہوتے ہیں یا مذہبی۔ اس گروہ بندانہ تعریق کی بنا پر ان تہواروں کا تعلق انسانوں کے ایک خاص حلقہ تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان میں کوئی تہوار بھی ایسا نہیں جسے تمام نوعِ انسانی بطور جشنِ مسرت منائے ـــ آج تو اس قسم کا کوئی تہوار نہیں لیکن قرآن کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے، ایک ایسا تہوار تجویز کیا تھا جسے پوری کی پوری عالمگیر انسانیت بطور جشنِ شادمانی منائے۔ اس تقریب کے سلسلہ میں اس نے کہا تھا ـــ يَآيُّهَا النَّاسُ۔ اے نوعِ انسان! قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ۔ تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے، تمہارے پاس ایک ایسا ضابطہ قوانین آگیا ہے جس میں ہر قسم کی نفسیاتی کشمکش کا علاج ہے اور جو ہر اس قوم کو جو اسے بطور ضابطہ حیات اختیار کر لیتی ہے، کامیابیوں کی راہ کی طرف راہ نمائی عطا کر دیتا ہے۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ۔ ان سے کہو کہ اس قسم کے ضابطہ حیات کا مل جانا محض خدا کے فضل و رحمت سے ہے۔ تم اسے کسی قیمت پر بھی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا۔ لہٰذا تمہیں چاہیئے کہ تم اس کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔ یہ ہر اس شے سے بہتر اور گراں بہا ہے جسے تم جمع کرتے رہتے ہو۔

یہ تھی وہ تقریب جسے خدا نے تمام نوعِ انسان کے لئے جشنِ مسرت منانے کے لئے تجویز کیا تھا ـــ یعنی نزولِ قرآن کی یاد میں جشنِ شادمانی۔ اور جو اب دنیا کی دوسری قوموں کے تہواروں کی طرح صرف "مسلمان قوم" کا تہوار بن کر رہ گیا ہے۔ اور وہ بھی ایسا کہ مسلمان اسے عید الفطر کہہ کر مناتے تو ہیں لیکن ان میں سے کتنے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ ہم یہ تہوار کیوں مناتے ہیں، اور یہ تقریب کس عظیم و جلیل واقعہ کی یاد میں مقرر کی گئی تھی۔ انہیں اب اتنا ہی علم ہے کہ اس عید پر سویاں کھائی جاتی ہیں اور بھک منگوں کو فطرانے کے پیسے دیئے

جانے لگا۔ آئیے ہم آج کی صحبت میں دیکھیں کہ اس تقریب کو خدا نے پوری نوعِ انسانی کے لئے جشنِ مسرت کیوں قرار دیا تھا۔

قرآن کریم نے انسان کی سرگذشت کو قصۂ آدم (یعنی "آدم کی کہانی") کے تمثیلی پیرایہ میں نہایت بصیرت افروز اور حقیقت کُشا انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اس داستان کے آغاز ہی میں بتایا گیا ہے کہ انسانوں سے کہہ دیا گیا تھا کہ تم ایک عالمگیر برادری کے افراد ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ تم میں وحدت رہے۔ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۲/۳۵)۔ اگر تم نے باہمی "مشاجرت" اختیار کر لی تو یاد رکھو! وہ جنتی زندگی جو وحدتِ انسانیت سے پیدا ہوتی ہے تم سے چھن جائے گی اور اس سے تمہیں سخت نقصان پہنچے گا۔ "مشاجرت" کہ جس کا مادہ "شجر" ہے کے معنی اختلاف اور تفرقہ کے ہیں۔

لیکن جب انسانوں میں "میری اور تیری" کی تفریق نمودار ہوئی تو ان کے مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہو گیا۔ اس ٹکراؤ کا لازمی نتیجہ باہمی اختلاف اور افتراق تھا۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (۱۰/۱۹)۔ تمام انسان ایک واحد برادری کی طرح رہتے تھے۔ لیکن بعد میں انہوں نے باہمی اختلافات پیدا کر لئے اور گروہوں میں بٹ گئے۔ اس تحزب و تشیع میں پھر سے وحدت پیدا کرنا تنہا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں تھی کہ عقل ہر فرد یا ہر گروہ کو اس کے اپنے مفاد کے تحفظ کا طریقہ تو سمجھا اور بتا سکتی ہے، عالمگیر انسانیت کے مفادات کا تحفظ اس کے حیطۂ کار سے باہر کی بات ہے۔ یہ وحدت، وحی کی راہنمائی ہی سے پیدا ہو سکتی تھی۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ تمام انسان شروع میں ایک برادری کی طرح رہتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے باہمی اختلافات پیدا کر لئے تو فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ۔ اللہ نے انبیاء کو بھیجنا شروع کیا جو انہیں تشتت و افتراق کی انسانیت سوز زندگی کے عواقب سے آگاہ کرتے، اور اس کے برعکس، وحدت و اخوت کے حیات بداماں نظامِ حیات کے خوشگوار نتائج ان کے لئے وجۂ نشاطِ روح بنتے۔ اس کے بعد قرآن نے اس امر کی بھی صراحت کر دی کہ وہ کونسا نسخہ کیمیا تھا جس سے حضرات انبیاء کرام ان اختلافات کو مٹانے کا طریق بتاتے تھے۔ کہا وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (۲/۲۱۳)۔ اور ان انبیاء پر خدا کی طرف سے کتاب نازل ہوئی جو یکسر حق و صداقت پر مبنی ہوتی۔ وہ (انبیاء کرام) لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ اس کتاب کی رو سے کرتے۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ انسانوں کے باہمی اختلافات مٹانے کے لئے خدائی پروگرام یہ تھا کہ:

(۱) ایک ضابطۂ قوانین ہو جس میں اختلافی امور میں عادلانہ فیصلہ دینے کی صلاحیت ہو۔ اور

(۲) ایک زندہ اور محسوس اتھارٹی ایسی ہو جو اس ضابطۂ قوانین کے مطابق لوگوں کے اختلافی امور کے فیصلے کرے۔

اس نظام کا نام الدّین تھا۔ اور یہی وہ الدّین تھا جسے قائم کرنے کے لئے حضرات انبیاء کرام مبعوث ہوتے تھے۔ سورۂ شوریٰ میں ہے کہ "اے رسول! ہم نے انہیں الدّین کا وہی راستہ دکھایا ہے جو راستہ بذریعہ وحی انبیاء سابقہ۔ نوحؑ ابراہیمؑ موسےٰؑ، عیسیٰؑ۔ کو دکھایا گیا تھا" انہیں یہ راستہ دکھایا گیا تھا اور ان سے کہا گیا تھا کہ

اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا (۴۲/۱۳)

وہ الدّین کا نظام اس طرح قائم کریں کہ انسانوں میں تفرقہ باقی نہ رہے۔

ایک رسول آتا؛ اور اس طرح الدّین کا نظام قائم کرکے چلا جاتا۔ لیکن اس کے بعد اس کے نام لیوا پھر باہمی تفرقہ پیدا کر لیتے۔ اس لئے نہیں کہ اس الدّین میں اختلاف وا تحاد برقرار رکھنے کی صلاحیت نہیں رہتی تھی۔ وَ مَا تَفَرَّقُوْا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًاۢ بَیْنَهُمْ (۴۲/۱۴)۔ ان کے نام لیوا مذہبی پیشوا، باہمی عناد اور ایک دوسرے پر غالب آجانے کے جذبہ کی وجہ سے اپنے اپنے فرقے بنا لیتے اور اس طرح انسانیت پھر گروہوں میں بٹ جاتی۔

یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ خدا کا آخری رسولؐ اس کی طرف سے آخری ضابطۂ حیات لے کر آگیا۔ یہ تھا وہ ضابطۂ حیات جس کے ملنے پر نوعِ انسانی سے کہا گیا تھا کہ وہ جشنِ مسرت منائیں کیونکہ اس سے ان کے باہمی اختلافات مٹ جائیں گے اور دنیا میں پھر سے ایک عالمگیر برادری کی تشکیل ہو جائے گی۔

قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ کسی انسان کی تصنیف نہیں بلکہ خدا کی کتاب ہے۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں اس نے متعدد دلائل دیئے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم اور بنیادی دلیل یہ ہے کہ

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۔ وَ لَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ

لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ۔ (۴/۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے؟ اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ اس میں کئی اختلاف پاتے۔

کسی کتاب میں اختلاف کی ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ (مثلاً) اس میں ایک جگہ کہا گیا ہو کہ خدا ایک ہے۔ اور دوسری جگہ ہو کہ خدا تین ہیں۔ تو یہ باہمی تضاد ہوگا۔ صرف اس قسم کا عدم تضاد کسی تصنیف کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ کسی کتاب میں تضاد بہت بڑا عیب ہے اور معیاری مصنفین کی تصنیفات اس قسم کے عیوب و اسقام سے بالعموم پاک ہوتی ہیں۔ بے شک قرآن کریم میں اس قسم کا بھی کوئی سقم نہیں لیکن

اس نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی جو دلیل دی ہے وہ اس سے بہت بلند ... ہے۔ اس آیت میں لفظ تدبر بڑا معنی خیز ہے۔ تدبر کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کے پیچھے پیچھے چل کر اس کے انجام یا مآل سے کسی نتیجہ پر پہنچنا۔ قرآن کی پیش کردہ دلیل کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تعلیم پر جب اور جہاں بھی عمل کیا جائے گا اس کا نتیجہ ہمیشہ ایک جیسا ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا کہ ایک گروہ اس پر عمل کرے تو وہ ایک نتیجہ پہ پہنچے اور دوسرا گروہ عمل کرے تو وہ اس کا نتیجہ کچھ اور ہو اور دوسرے کے مخالف ہو۔ یہ نکتہ قوانینِ فطرت کی مثال سے زیادہ واضح ہو جائے گا۔ طبیعات (سائنس) کا ایک بنیادی قانون ہے۔ وحدتِ فطرت (LAW OF UNIFORMITY OF NATURE)۔ اس سے مراد یہ ہے کہ فطرت کے قوانین پر جہاں بھی عمل کیا جائے گا نتیجہ یکساں مرتب ہوگا۔ پانی ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر بھاپ بننا شروع ہو جائے گا اور خاص برودت پر پہنچ کر منجمد ہو جائے گا۔ گندم کے بیج سے گندم پیدا ہوگی اور چنے کے بیج سے چنا ہر جگہ اور ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔ فطرت کے قوانین انسانوں کے وضع کردہ نہیں۔ یہ خالقِ فطرت کے پیدا کردہ ہیں۔ یہی دلیل قرآن نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دی ہے۔ یعنی اس پر عمل کرنے سے انسان ہمیشہ ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں گے۔ لہذا ان کے اختلافات مٹ کر ان میں وحدت پیدا ہو جائے گی۔

اگر دو سائنٹسٹ اپنی اپنی لیبارٹری میں کسی فارمولے پر عمل کر رہے ہوں ... کا نتیجہ ایک، دوسرے سے مختلف ہو تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ وہ دونوں ایک ہی فارمولے پر عمل نہیں کر رہے تھے۔ وہ مختلف فارمولوں پر عمل کر رہے تھے۔ فارمولوں کے اس طرح کے اختلاف کو قرآن کی اصطلاح میں شرک کہا جاتا ہے۔ اگر ایک فارمولے پر عمل کرنے والوں میں باہمی اختلاف نہیں تو اسے توحید کہا جائے گا۔ اور اگر ان میں باہمی اختلاف ہوگا تو اسے شرک سے تعبیر کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے، امتِ واحدہ کے فرقوں میں تقسیم ہو جانے کو شرک کہہ کر پکارا ہے۔ سورۂ روم میں ہے۔ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ اے جماعتِ مومنین تم توحید پرست ہو جانے کے بعد پھر مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۲)

اس فرقہ بندی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فرقہ اس فریبِ نفس میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ ہم تو حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر۔

جس قوم میں وحدت نہیں رہتی ـــ وہ گروہوں، فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ جاتی ہے۔ تو اس پر ذلت و خواری کا عذاب مسلط ہو جاتا ہے۔ اختلافات کا یہی وہ مآل ہے جس سے متنبہ کرتے ہوئے مسلمانوں سے کہا گیا تھا کہ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ۔ دیکھنا! کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے باہمی اختلافات کئے اور فرقوں میں بٹ گئے، حالانکہ ان کے پاس خدا کی طرف سے واضح تعلیم آ چکی تھی۔ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۳/۱۰۴)۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ سخت عذاب

میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس سے اگلی آیت میں فرقہ بندی اور باہمی اختلافات کو "کفر بعد ایمان" کہہ کر پکارا گیا ہے (۳/۱۰۶)۔ یعنی سورۂ روم میں فرقہ بندی کو شرک کہا گیا ہے اور یہاں اسے کفر بعد از ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۂ محمد میں اسے ارتداد (مرتد ہو جانا) کہا گیا ہے۔ (۴۷/۲۵)

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ امت میں فرقوں کا وجود شرک ہے، کفر ہے، ارتداد ہے۔ یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر کسی معاملہ میں باہمی اختلاف پیدا ہو جائے تو اُسے رفع کرنے کے لئے کیا کیا جائے؟ اس کے لئے قرآن میں ہے کہ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (۴۲/۱۰) (جس بات میں تم میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس کا فیصلہ خدا (کی کتاب) سے لیا کرو۔ کتاب اللہ کے نازل کرنے سے مقصد ہی یہ تھا کہ یہ اختلافی امور میں واضح طور پر بتا دے کہ صحیح بات کیا ہے۔ (۱۶/۸۹)

لیکن اختلافی معاملات میں قرآن سے فیصلہ لینے کی صورت یہ نہیں کہ فریقین اپنے اپنے طور پر قرآن سے فیصلہ لینے لگ جائیں۔ اس کے لئے خدا نے ایک عملی نظام مقرر کیا تھا اور وہ عملی نظام یہ تھا کہ فریقین ایک ثالث کے پاس جائیں اور اس کے فیصلہ کو بطیبِ خاطر منظور کریں۔ نبی اکرمؐ کی حیاتِ ارضی میں یہ ثالث خود رسول اللہؐ تھے، جو بحیثیت مرکزِ حکومتِ خداوندی جملہ اختلافی امور کے فیصلے فرمایا کرتے تھے۔ یہی وہ حقیقتِ کبریٰ تھی جس کے متعلق کہا گیا تھا کہ "تیرا رب اس بات پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے اختلافی معاملات میں (اے رسولؐ) تمہیں اپنا حکم تسلیم نہ کریں۔ اور پھر ان کی کیفیت یہ ہو کہ جو کچھ تو فیصلہ کرے اس کے خلاف یہ اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں بلکہ دل و دماغ کی کامل رضامندی سے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ (۴/۶۵)

اسی سورہ میں دوسرے مقام پر اس عملی نظام کی تصریح ان الفاظ سے کر دی کہ جماعتِ مومنین کے لئے ضروری ہے کہ یہ اللہ۔ اس کے رسول۔ اور ان افسرانِ ماتحت کے احکام کی اطاعت کریں جنہیں اس مقصد کے لئے تعینات کیا گیا ہو پھر اگر کسی کو ان افسرانِ ماتحت کے کسی فیصلے سے اختلاف ہو تو وہ اس کے خلاف "خدا اور رسولؐ" (مرکزی حکومتِ خداوندی) کے ہاں اپیل کر سکتا ہے۔ لیکن مرکز کا فیصلہ آخری ہوگا۔ (۴/۵۹) حتیٰ کہ ان سے یہ بھی کہا گیا کہ مملکت میں خوف یا امن سے متعلق کوئی بات بھی ان تک پہنچے تو یہ اسے اپنے طور پر نہ لے اڑا کریں۔ انہیں چاہیئے کہ اسے افسرانِ ماتحت یا مرکزی حکومت (رسولؐ) تک پہنچائیں تاکہ وہ مناسب تحقیق و تفتیش کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچ کر فیصلہ کریں (۴/۸۳)

یہ تھا وہ عملی نظام جسے اختلافات رفع کرنے کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔ یعنی افرادِ امت ہر اختلافی معاملہ کے لئے حکومت کے نمائندگان کی طرف رجوع کریں۔ افرادِ امت سے تو یہ کہا اور فیصلہ دینے والی اتھارٹی کو اس کی تاکید کی گئی کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ ۔ (۵/۴۸) لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو۔

یہ تھا وہ نظام جو امت میں وحدت قائم کرنے اور اسے اختلافات کے عذاب سے محفوظ رکھنے کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں الدّین اور عرفِ عام میں اسلامی مملکت کہا جاتا ہے۔ جب تک یہ نظام قائم رہا امت میں نہ کوئی اختلاف پیدا ہوا اور نہ کوئی فرقہ۔ جب یہ نظام بگڑا تو مسلمان اس مقام پر آ گئے جس مقام پر اسلام سے پہلے اہلِ کتاب تھے۔ ان کا الدّین، مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ اجتماعیت کی جگہ انفرادیت آ گئی۔ مرکزیت کے بجائے انتشار پیدا ہو گیا۔ ان میں کوئی ایسی اتھارٹی نہ رہی جو ان کے اختلافی معاملات نہیں ختم کر سکے۔ امت مختلف فرقوں میں بٹ گئی اور ہر فرقہ اپنی اپنی شریعت (فقہ) پر عمل کرنے لگ گیا۔ قرآن نے جو فرقہ بندی کو شرک قرار دیا تھا، تو اس کی وجہ یہی تھی کہ اس میں ایک قانون پر عمل کرنے کے بجائے مختلف قوانین پر عمل کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کر دی تھی کہ اَمْ لَھُمْ شُرَکٰٓؤُا شَرَعُوْا لَھُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا لَمْ یَاْذَنْ بِہِ اللّٰہُ (۲۱:۴۲)۔ یعنی الدّین میں مختلف شریعتیں دینے والے درحقیقت خدا کے شریک ہیں۔

مسلمانوں میں یہی کیفیت اس وقت تک چلی آ رہی ہے۔ یعنی ان کے ہاں امت کا تو وجود ہی نہیں رہا صرف فرقے موجود ہیں۔ اور جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، فرقوں کی موجودگی میں اسلام باقی نہیں رہتا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں مرکزی اتھارٹی نہیں رہی تھی لیکن قرآن تو بہرحال ان کے پاس موجود تھا۔ اس کی موجودگی میں ان کے ہاں اس قدر مختلف اور باہمدگر متضاد عقائد اور شریعتیں کس طرح پیدا ہو گئیں۔ سوال بڑا اہم ہے اور اس کا جواب بڑا غور طلب۔ اگر مسلمان صرف قرآن ہی کو قانون کی اساس ملتے رہتے تو بھی ان میں اس قدر اختلافات پیدا نہ ہوتے۔ لیکن انہوں نے قرآن کے ساتھ "اس کی مثل" (مثلہ معہ) ایک اور اساسی قانون تجویز کر لیا۔ انہیں روایات کہا جاتا ہے۔ روایات سے ابتدائی اور بنیادی مفہوم تھا وہ باتیں جنہیں، ان کے بیان کرنے والے (راوی) رسول اللہؐ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ واضح رہے کہ رسول اللہؐ نے اپنی باتوں (احادیث) کا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا تھا، نہ ہی صحابہ کرامؓ نے کوئی ایسا مجموعہ مرتب کیا تھا۔ حضورؐ کی وفات کے قریب اڑھائی سو سال بعد لوگوں نے اپنے اپنے طور پر روایات کے مجموعے مرتب کئے، اور وہ بھی لوگوں سے زبانی سن کر۔ ان میں امام بخاریؒ کے مرتب کردہ مجموعہ کو سب سے صحیح مانا جاتا ہے۔ روایات کی اصل حقیقت تو اتنی تھی لیکن بعد میں انہیں احادیثِ نبویؐ کہہ کر پکارا گیا۔ یعنی پہلے تو انہیں ایسی باتیں کہا جاتا تھا جنہیں لوگ رسول اللہؐ کی طرف منسوب کرتے تھے لیکن بعد میں انہیں احادیثِ رسول اللہ یعنی خود رسول اللہؐ کی باتیں مشہور کر دیا گیا۔ اس اصطلاح سے لوگوں کے دلوں میں فطری طور پر ان کی عظمت اور عقیدت اور بڑھ گئی۔ اس کے بعد انہیں سنتِ رسول اللہؐ قرار دے دیا گیا۔ قرآن تو ساری امت کے پاس ایک ہی تھا لیکن روایات یا احادیث، یا سنت

رسول اللہ ہر فرقے کی الگ الگ ہیں۔ ان سے مختلف شریعتیں (مختلف فرقوں کی فقہیں) مرتب ہوئیں۔ یہ فقہیں بھی الگ الگ لیکن ہر فرقہ کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ "کتاب و سنت" کے مطابق ہیں۔ "کتاب و سنت" کی اصطلاح میں لفظ تو "کتاب" کا پہلے آتا ہے لیکن عملاً مقدم حیثیت "سنت" یعنی روایات کو حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر فرقہ قرآن کی آیات کا وہی مفہوم قابل قبول قرار دیتا ہے جو اس فرقے کے ہاں کی روایات کی رو سے متعین کیا جائے۔ حتیٰ کہ جہاں قرآن کی کسی آیت اور روایت میں اختلاف ہو تو قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھا جاتا ہے اور عمل روایت کے مطابق ہوتا ہے۔ مختصراً امت کی صدیوں سے کیفیت یہ ہے کہ

(۱) اختلافی معاملات میں فیصلہ دینے والی اتھارٹی (اسلامی حکومت) غائب ہے۔

(۲) ہر فرقہ دعویٰ یہ کرتا ہے کہ اس کا عمل "کتاب و سنت" کے مطابق ہے۔ لیکن درحقیقت اس کی شریعت کا مدار روایات پر ہے اور روایات ہر فرقہ کی الگ الگ ہیں۔

آپ "کتاب و سنت" کے مطابق عمل پیرا ہونے کے دعوے کا تجزیہ کریں گے تو آپ کے سامنے عجیب صورت آئے گی۔ ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اب اگر مسلمانوں کے ہر فرقے کے اس دعویٰ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ اس کا عمل قرآن کے مطابق ہے تو اس سے لازماً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) خدا کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے کہ اس کی کتاب میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ جس کتاب سے مختلف فرقوں کو اس قدر مختلف احکامات مل سکتے ہوں اس کا یہ دعویٰ کس طرح صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں؟ لہٰذا یا تو یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ (معاذ اللہ) خدا کا یہ دعویٰ مبنی بر حقیقت نہیں اور اگر خدا کا دعویٰ سچا ہے (اور اس کے سچا ہونے میں کس مسلمان کو شک ہو سکتا ہے) تو پھر لازماً اسے تسلیم کرنا ہو گا کہ ان فرقوں کا یہ دعویٰ سچا نہیں کہ ان کا عمل مطابق کتاب اللہ ہے۔

ان فرقوں سے پوچھئے کہ ان کے نزدیک ان دونوں میں سے کون سی بات صحیح ہے؟

اب آیئے اتباع سنت کے دعویٰ کی طرف۔ تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ سے کہا تھا کہ

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ
فِي شَيْءٍ ۔ (۶/۱۵۹)

جو لوگ دین میں فرقے پیدا کر لیں اور خود بھی ایک گروہ بن جائیں تو (اے رسول!)
تیرا ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں۔

اس سے واضح ہے کہ فرقوں میں بٹی ہوئی امت کا رسول اللہ کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا ان کا یہ دعویٰ کہ یہ سنت رسول اللہ کا اتباع کرتے ہیں، باطل ہے۔

یہ ہے اعتصام بکتاب و سنت کے دعویٰ کی حقیقت! قیام پاکستان کے بعد ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے یہ مطالبہ پیش کیا گیا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم کیا جائے گا جس کی بنیاد کتاب و سنت پر رکھی جائے گی جن لوگوں کی نگاہ قرآنی تعلیمات پر تھی وہ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ

(۱) اسلامی نظام میں ساری قوم "امت واحدہ" ہوتی ہے۔ اس میں فرقوں کا وجود نہیں ہوتا۔

(۲) اسلامی نظام میں ضابطہ قوانین ایک ہی ہوتا ہے جس کا اطلاق تمام افراد امت پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔

لیکن اس کے برعکس ہماری مذہبی پیشوائیت اسلامی نظام کا یہ نقشہ پیش کرتی تھی کہ

(۱) مسلمانوں کے مسلّمہ فرقوں کا وجود آئینی طور پر تسلیم کیا جائیگا۔

(۲) شخصی قوانین ہر فرقے کے الگ الگ ہوں گے۔

(۳) ملکی قوانین کتاب و سنت کی رو سے مرتب کئے جائیں گے۔ اس سے یہ تأثر دیا جانا مقصود تھا کہ کتاب و سنت کی رو سے ملکی قوانین ایسے مرتب ہو سکتے ہیں جنہیں تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کرلیں۔

طلوع اسلام نے کہا کہ اول تو جس نظام میں امت فرقوں میں بٹی رہے اور مسلمانوں کے شخصی اور ملکی قوانین میں تخصیص و تمیز کی جائے وہ نظام قرآن کی رو سے اسلامی کہلا ہی نہیں سکتا۔ اور ثانیاً یہ دعویٰ یکسر فریب پر مبنی ہے کہ کتاب و سنت کی رو سے ملکی قوانین ایسے مرتب ہو سکتے ہیں جنہیں تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کرلیں۔ ایسا قطعاً ناممکن ہے۔ اس پر طلوع اسلام کے خلاف وہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ تو بھلی — اور اب بائیس تئیس برس کے پر فریب پروپیگنڈہ کے بعد انہیں بالآخر اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ

> کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو
>
> (مودودی)

لیجئے! اسلامی نظام کے قیام کے دعویٰ کی قلعی کھل گئی۔

لیکن ہماری قوم کی حالت عجیب ہے۔ ایک طرف وہ یہ بھی سن رہی ہے کہ کتاب و سنت " کی بنیاد پر کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا، اور دوسری طرف، ملک کی ہر پارٹی اعلان پر اعلان کئے جا رہی ہے کہ اگر ہماری پارٹی برسر اقتدار آگئی تو ہم کتاب و سنت کے مطابق نظام قائم کریں گے اور قوم میں سے کوئی ان سے نہیں پوچھتا کہ جب تم خود کہتے ہو کہ ایسا ہونا ناممکن ہے تو پھر اس دعویٰ کو دہراکیسے رہے ہو؟ جب قوم کی غفلت اور بے حسی کا یہ عالم ہو تو پھر رہزنوں پر کیا گلہ کہ وہ اسے لوٹتے کیوں ہیں۔

جب یہ پرچہ آپ کے ہاتھوں تک پہنچے گا تو الیکشن کے دن قریب تر ہو گئے اور انتخاب لڑنے والوں کا جنون انتہا تک پہنچ چکا ہوگا۔ اس جنون میں کسی سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کوئی معقول بات سننے کے لئے آمادہ ہو

جائے گا، خودکشی کے مرادف ہوگا۔ لیکن اس کے بعد (اگر الیکشن بخیر و خوبی تکمیل تک پہنچ گئے تو) منتخب شدہ امیدوار مجلس دستور ساز کی شکل میں یک جا ہو جائیں گے اور ایک سو بیس دنوں میں دستور سازی کا مرحلہ شروع ہو جائے گا۔ دستور میں اس بنیادی اصول کا طے پانا ضروری ہوگا کہ ملک میں قانون کی اساس کیا ہوگی؟ اس وقت تک یہ حضرات دستور میں پہلے سے یہ شق رکھ دیا کرتے تھے کہ ملک کا کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ لیکن اس اعتراف کی موجودگی میں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اگر انہوں نے پھر یہی شق شاملِ دستور کرنا چاہی تو آپ سوچ لیجئے کہ یہ قوم سے کس قدر فریب ہوگا! ضرورت اس امر کی ہے کہ مجلس دستور ساز کے اراکین سے یہ سوال پوچھا جائے کہ ملک میں قانون کی اساس کیا ہوگی؟

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب ایک اور صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہمیں اس مقصد کے لئے اس دور کی طرف پلٹ جانا چاہیئے جب پہلے پہل اسلامی نظام کا وجود عمل میں آیا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس وقت اسلامی نظام کی تشکیل کے لئے دو اجزاء لاینفک تھے۔ ایک کتاب اللہ جو قانون کی اساس تھی اور دوسرے وہ اتھارٹی جو متنازعہ فیہ معاملات میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے دیتی تھی۔ آج ہمارے پاس بتوفیق ایزدی یہ دونوں اجزاء موجود ہیں۔ کتاب اللہ کی موجودگی کے متعلق کسی فرقے کو بھی کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ اتھارٹی کے لئے ہمارے ہاں ایک ایسی مملکت موجود ہے جس میں ہنوز کسی فرقے کی حکومت ... ... برسرِ اقتدار نہیں آئی۔ اگر ہم اپنے آئین میں کتاب اللہ کو اساس قرار دے کر ایک ایسی اتھارٹی کا تعین کر دیں جو اس باب میں حَکم بن سکے تو سارا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے شرطِ اولین یہ ہے کہ قرآن مجید سے اس طرح فیصلہ لینے کے لئے کسی خاص فرقہ کی روایات یا فقہ اثر انداز نہ ہو۔ اگر قوم اس کے لئے تیار ہے تو اس ملک میں اسلامی نظام کا قیام ممکن العمل ہوگا۔ اگر وہ اس کے لئے تیار نہیں تو پھر ہم جس قدر جلد اس خودفریبی سے نکل جائیں (کہ ہم اسلامی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں) اسی قدر بہتر ہوگا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ قوم تو اس کے لئے تیار ہو جائے گی لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت اس کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوگی۔ اس لئے کہ اسلامی نظام میں مذہبی پیشوائیت کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اس وقت یہ حضرات جو "اسلامی نظام" کا شور مچا رہے ہیں، تو اس لئے کہ اس سے ان کا مقصد خود اپنی حکومت قائم کرنا ہے۔ آپ نے غور نہیں کیا کہ مودودی صاحب نے جو یہ تجویز پیش کی ہے کہ چونکہ کتاب و سنت کی رو سے کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا اس لئے ملک میں فقہ حنفی رائج کر دی جائے تو اس کا مطلب کیا ہے؟ (واضح رہے کہ ہمیں نہ کسی خاص فرقے کی فقہ سے دشمنی ہے نہ کسی دوسرے فرقہ کی فقہ سے دوستی۔ چونکہ مودودی صاحب نے فقہ حنفی کا متعین طور پر نام لیا ہے اس لئے ہم بھی اسی کے حوالے سے بات کر رہے ہیں)۔ فقہ حنفی، ایک ضابطہ

قوانین ہے۔ اس ضابطہ کو ملک کا قانون قرار دے دیا جائے تو پھر ملک میں کسی مجلس قانون ساز (LEGISLATIVE ASSEMBLY) کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ جب قانون بنا بنایا موجود ہے تو مجلس قانون سازی کی ضرورت کیا ہے۔ اگر اس میں کوئی دشواری پیش آئے گی تو اس کے لئے، اس فقہ کے ماہرین (علماء حضرات) کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ منیر کمیٹی کے سوال کے جواب میں، علماء حضرات نے یہی موقف اختیار کیا تھا۔ اس سے واضح ہے کہ جب آپ یہاں کوئی بنی بنائی فقہ رائج کریں گے تو اس کا عملی نتیجہ مذہبی پیشوائیت کی تھیاکریسی ہوگا۔

(۰)

جب ان حضرات کے سامنے قرآن مجید کی وہ آیات پیش کی جاتی ہیں جن میں فرقہ بندی کو شرک، کفر اور ارتداد قرار دیا گیا ہے تو ان میں سے ہر فرقہ کا جواب یہ ہوتا ہے کہ صاحب! ہم نے فرقہ نہیں بنایا۔ ہم تو اسی اسلام پر قائم چلے آرہے ہیں جو نبی اکرمؐ کے زمانے میں رائج تھا۔ ان دوسرے فرقوں نے اپنا اپنا اسلام الگ تجویز کر لیا اور ہم سے علیحدہ ہو گئے۔ آپ ان سے کہیئے کہ یہ اپنا جداگانہ مسلک چھوڑ کر اصل اسلام کی طرف آجائیں — یعنی ہمارا مسلک اختیار کریں۔

ہر فرقہ کا جواب یہی ہوگا کہ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ۔ کی عملی تفسیر یہی ہے اور ہزار سال کے بین الفرق مناظروں اور مباحثوں کا مقصد یہی تھا کہ ہر فرقہ یہ ثابت کر دے کہ اصل اسلام کے علمبردار وہی ہیں۔ نہ یہ ثابت ہوا نہ ثابت ہو سکیگا۔ اس لئے کہ جب قرآن نے کہا تھا کہ فرقہ واری میں کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ ہم حق پر ہیں اور دوسرے باطل پر — تو اس نے کسی ایک فرقہ کی بھی استثناء نہیں کی تھی۔ وہ (قرآن) اس سوال ہی کو درخور اعتناء نہیں سمجھتا کہ فرقوں میں سے کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔ وہ امت میں فرقوں کے وجود ہی کو شرک قرار دیتا ہے۔

فرقہ سازی کے سلسلہ میں یہ نہیں ہوا تھا کہ امت ایک مسلک پر چلی آرہی تھی۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ لوگ اس انبوہ میں سے نکل نکل کر الگ ہوتے گئے اور اس طرح مختلف فرقوں کا وجود عمل میں آگیا اور اب ہر فرقہ کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ گروہ جو صحیح اسلام کے راستے پر گامزن تھا، ہم ہیں، اور دوسرے لوگ ہم میں سے نکل کر الگ ہو گئے تھے۔ ہوا دراصل یہ تھا کہ جب امت میں مرکزی اتھارٹی (خلافت علیٰ منہاج نبوت) باقی نہ رہی تو ان کی (مسلمانوں کی) جمعیت پارہ پارہ ہو گئی۔ اسی منتشر شدہ امت کا نام مختلف فرقے ہیں۔ قرآن نے امت میں تشتت و انتشار کو شرک اور کفر قرار دیا ہے۔ اس میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ فلاں فرقہ صحیح راستے پر چلا آرہا تھا۔ اور دوسرے فرقے اس میں سے نکل کر الگ ہو گئے۔ لہٰذا فرقہ بندی کے جرم کے مرتکب وہ فرقے ہیں یہ نہیں۔ جب زلزلہ سے کوئی چٹان ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے تو ان میں

سے کوئی ٹکڑہ بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تو اصلی چٹان ہوں، اس میں سے الگ ہونے والے ٹکڑے دوسرے ہیں۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے سے چٹان کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اس لئے کوئی ٹکڑہ بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ چٹان ہے۔ امت میں انتشار پیدا ہو جائے تو اسلام باقی نہیں رہتا۔ اس لئے کسی فرقے کا یہ دعویٰ قابلِ پذیرائی نہیں ہو سکتا کہ وہ حقیقی اسلام کا پیرو ہے اور باقی فرقے باطل پر ہیں۔ منتشر شدہ چٹان کو پھر سے وجود میں لانے کا طریق یہ نہیں کہ مختلف ٹکڑوں سے یہ کہا جائے کہ وہ کسی ایک ٹکڑے میں جا کر جذب ہو جائیں۔ اس کا طریق یہ ہے کہ سب ٹکڑے یک جا ہو کر پھر سے چٹان بن جائیں۔ اسی طرح مختلف فرقوں سے یہ کہنا کہ وہ کسی ایک فرقہ کی فقہ کو اسلامی تسلیم کر کے تفرقہ کو ختم کر دیں، ناممکن العمل مطالبہ ہے۔ ان میں پھر سے وحدت پیدا کرنے کا طریق یہ ہے کہ تمام فرقے اپنی اپنی روایات اور فقہ کو الگ کر کے قرآن خالص کو قانون کی اساس قرار دے لیں۔ اور اس اساس پر ایسا ضابطہ قوانین مرتب کر لیں جو عصرِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کر سکنے کے قابل ہو۔ اس کے سوا اسلامی نظام کے قیام کی کوئی صورت نہیں۔

اس مقام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ قرآنِ خالص کی بنیاد پر بھی کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ اور اس کی تائید میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ہمارے ہاں فرقہ اہل قرآن نے ایسا دعویٰ کیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود ان کے ہاں اتفاق پیدا نہ ہو سکا۔ گنتی کے چند نفوس اس فرقہ سے متعلق ہیں اور ان میں بھی باہمی اختلاف ہے۔

یہ حقیقت ہے لیکن اس کی وجہ کچھ اور ہے جس شخصیت کی طرف یہ فرقہ اپنے آپ کو منسوب کرتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے فطرت کی طرف سے دلِ درد مند عطا ہوا تھا۔ وہ امت کے انتشار پر خون کے آنسو روتا تھا۔ اس نے جب اس کی علت پر غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے قرآن کے ساتھ اور چیزوں کو بھی دین کی اساس قرار دے رکھا تھا۔ اس تفرقہ کو مٹانے کا طریق یہ ہے کہ قرآن خالص کو دین کی اساس قرار دیا جائے۔

یہاں تک تو اس کی نگاہ نے صحیح کام کیا لیکن وہ وحدتِ امت کی دوسری لاینفک کڑی تک نہ پہنچ سکی۔ یعنی قرآن کے ساتھ ایک مرکزی اتھارٹی کے وجود کا تصور ان کے سامنے نہ آسکا۔ چنانچہ وہ خود ہی قرآن سے فقہی احکام مستنبط کرنے لگے ——— بالفاظِ دیگر وہ مذہب کی سطح پر ہی رہے۔ اسلام کو بہ حیثیت ایک نظام (الدین) کے سامنے نہ لا سکے۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ امت میں وحدت پیدا ہونے کے بجائے اس میں ایک اور فرقے کا اضافہ ہو گیا۔

طلوعِ اسلام کے پیشِ نظر وحدتِ امت کی دو لونوں کڑیاں ہیں ——— قرآن بطور اساسِ قانون، اور

مرکزی اتھارٹی بطور حکم --- یہی وجہ ہے کہ یہ کسی فرد یا گروہ کو اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ نئے نئے فقہی احکام مرتب کر کے امت میں مزید انتشار کا موجب بنے --- وہ تین نمازوں، تو دن کے روزوں، یا اردو میں نماز وغیرہ قسم کی تشتت آفریں تحریکوں کا سخت مخالف ہے۔ اس کا مسلک یہ ہے کہ اس وقت مختلف فرقے جس جس مسلک کے پابند ہیں، ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کی جائے۔ اور ایک مرکزی اتھارٹی (اسلامی مملکت) قائم کر کے، قرآن کی اساس پر جدید فقہ مرتب کی جائے جس کی پابندی ہر ایک پر لازم ہو۔

--- (د) ---

جب انہیں فرقہ بندی کے جواز میں کوئی دلیل نہیں مل سکی تو ہماری مذہبی پیشوائیت نے اب ایک اور ٹیکنیک اختیار کی ہے۔ اب یہ فرقوں کو فرقے نہیں کہتے۔ "مختلف مکاتبِ فکر" کہہ کر پکارتے ہیں اور اس طرح (اپنے آپ کو تو نہیں لیکن دوسروں کو) فریب دینے کی سعی لاحاصل میں وقفِ اضطراب ہیں۔ یاد رکھیئے! ہمارے مذہبی فرقے "فرقے" ہیں، مکاتب فکر نہیں۔ فرقہ اور مکتبِ فکر میں جو فرق ہے وہ سمجھنے کے قابل ہے۔ قرآن کریم میں بیشتر احکام واصول ہیں جو اسلامی نظام میں قانون کی اساس قرار پاتے ہیں اور کچھ حقائق کائنات ہیں۔ احکام واصول متعین ہیں اور ان کی بنیاد پر جو ضابطہ قوانین مرتب ہوتا ہے وہ امت میں وحدت پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کا موجب بنتا ہے۔ جب مختلف گروہ، مختلف چیزوں کو قانون کی اساس قرار دے لیں اور مختلف احکام پر عمل پیرا ہو جائیں تو انہیں فرقے کہا جاتا ہے۔

جہاں تک حقائقِ کائنات کا تعلق ہے، انہیں، ہر دور میں، اس دور کی علمی سطح اور کائناتی تحقیقات کے مطابق سمجھا جا سکتا ہے۔ نیز ایک ہی زمانہ میں، انہیں مختلف افراد اپنی اپنی علمی اور فکری صلاحیت کے مطابق سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم نے اجرام فلکی کے متعلق جو کچھ کہا ہے اسے مختلف زمانوں میں، ان زمانوں کے علم الافلاک کی روشنی میں، مختلف انداز سے سمجھا جاتا رہا۔ آج ان کا مفہوم کچھ اور سامنے آرہا ہے۔ جو لوگ کسی ایک دور میں، ان حقائق کے متعلق، کسی ایک نظریہ کے قائل ہوں، انہیں ایک مکتبِ فکر (SCHOOL OF THOUGHT) سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً نیوٹن کا مکتبِ فکر، آئن سٹائن کا مکتبِ فکر وغیرہ۔ ان مکاتبِ فکر سے متعلق لوگ مختلف قوانین پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔ وہ جس مملکت میں رہتے ہیں، اس مملکت کے قوانین کی اطاعت کرتے ہیں اس لئے وہ مختلف مکاتبِ فکر سے متعلق ہونے کے باوجود، مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے نہیں ہوتے۔ لیکن اگر وہ عملی زندگی میں مختلف راستے اختیار کر لیں تو وہ مختلف فرقوں میں بٹ جائیں گے۔ مثلاً آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کے قائل عیسائی رومن کیتھولک بھی ہو سکتے ہیں اور پروٹسٹنٹ بھی۔ یہ لوگ، ایک مکتبِ فکر سے متعلق ہونے کے باوجود، جب مذہب کی دنیا

کی طرف آئیں گے تو دو فرقوں میں بٹ جائیں گے۔

اور اگر ایسا ہو (جیسا کہ ہمارے ہاں ہوا ہے) کہ حقائقِ کائنات سے متعلق فکری اختلاف کو فرقہ کی بنیاد بن جائے تو اس طرح پیدا شدہ فرقوں کو فرقے کہا جائے گا۔ مکاتبِ فکر نہیں۔ فرقوں کا امتیازی نشان اختلاف فی العمل ہوتا ہے اور امت کی وحدت کی علامت ہوتی ہے اتحاد فی العمل جو قانون کی اساس کی وحدت پر مبنی ہوتا ہے۔ مکتبِ فکر کی مثال دیکھنی ہو تو طلوعِ اسلام کی تحریک کا مطالعہ کیجئے۔ یہ ایک خاص فکر تو پیش کرتی ہے لیکن امت' اسلامی شعائر کی تعمیل جس جس طریق سے کر رہی ہے ان میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا کر سکے' اس میں مزید تشتت کا موجب نہیں بنتی۔ اس لئے یہ تحریک ایک مکتبِ فکر کہلا سکتی ہے فرقہ نہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ خود فیصلہ فرما لیجئے کہ ہمارے موجودہ فرقے' فرقے ہیں یا مختلف مکاتبِ فکر۔ فرقہ بندی کے اعتراض سے بچنے کے لئے انہیں مکاتبِ فکر کہہ دینا، کتنی بڑی مغالطہ آفرینی اور ابلہ فریبی ہے! یاد رکھیے۔ جب تک ہم حقائق کا سامنا کرنے کی جرأت اپنے اندر پیدا نہیں کرتے' ہمارا کوئی بھی الجھا ہوا مسئلہ سلجھ نہیں سکتا۔ حقیقت (FACT) یہ ہے کہ فرقوں کی موجودگی میں اسلامی نظام کسی صورت میں قائم نہیں ہو سکتا۔ اور اگر مختلف فرقے' اپنی بنائے تفریق (روایات اور فقہ) پر اسی طرح جمے رہے تو پھر اسلامی مملکت کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکیگا۔

آپ نے دیکھا کہ پاکستان ہی کی نہیں بلکہ اسلام کی تاریخ میں یہ مقام کس قدر اہم اور نازک ہے۔ — "پل صراط" کی طرح تلوار سے تیز اور بال سے باریک' کہ جس پر ایک قدم کی لغزش پوری کی پوری قوم کو جہنم کے عمیق غاروں میں دھکیل دے گی۔ فَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّارِ۔ ہمیں امید ہے کہ طلوعِ اسلام کی فکر سے متفق حلقہ' ایسے نازک وقت میں اپنی اہم ذمہ داری کا پورا پورا احساس کرے گا اور مجلسِ آئین ساز کے ارکان سے متعین طور پر پوچھے گا کہ وہ مجوزہ آئین میں قانون کی اساس کیا تجویز کر رہے ہیں؟ اگر بات ان کی سمجھ میں آگئی، اور انہوں نے جرأت کر کے' قرآن کو قانون کی اساس قرار دے دیا؛ تو اس سے آپ کا اس سال کا جشنِ نزولِ قرآن عالمِ انسانیت کے لئے ہزار مسرت، اور صد ہزار انبساط کا موجب ہو گا! — اور اگر انہوں نے قوم کو اسی چکر میں رکھا جس میں اُسے صدیوں سے رکھا جا رہا ہے تو پھر یہ جشن' سوّیوں کی عید سے زیادہ حیثیت اختیار نہیں کر سکے گا۔ اور وہ بھی کب تک؟

—— (۰) ——

بسِّ تحریر

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ مودودی صاحب کی وہ تقریر سامنے آئی جو انہوں نے ۱۷ نومبر کو اپنی انتخابی مہم کے سلسلہ میں ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر کی تھی۔ یہ تقریر اس ضمن میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔

صدر ایوب کے ۱۹۶۲ء کے آئین میں کہا گیا تھا کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو اسلام کے خلاف ہو۔ اس پر مودودی صاحب نے بہت شور مچایا کہ یہ بہت بڑا دھوکا ہے۔ "اسلام" ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے مختلف مفہوم لئے جا سکتے ہیں۔ اس کی جگہ متعین اصطلاح "کتاب و سنت" کی ہونی چاہیئے۔ چنانچہ ایک ترمیم کے ذریعے اس آئین میں "اسلام" کی جگہ "کتاب و سنت" کے الفاظ درج کرا لئے گئے۔ اور یہی الفاظ مودودی صاحب نے اپنے منشور انتخابات میں بھی استعمال کئے۔

اب جو "کتاب و سنت" کی اصطلاح کے سلسلہ میں مودودی صاحب کا مواخذہ ہوا، اور انہیں تسلیم کرنا پڑا کہ اس سے کوئی متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا تو انہیں میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ چنانچہ ان کی ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی زیرِ نظر تقریر میں کہیں "کتاب و سنت" کے الفاظ نہیں آئے۔ اس کی بجائے انہوں نے کہا ہے۔

(۱) جماعتِ اسلامی ۳۰ سال سے پاکستان میں اس مقصد کے لئے کام کر رہی ہے کہ یہاں معاشرہ اور ریاست کی تعمیر دیانت اور انصاف کے ان اصولوں پر کی جائے جو اسلام نے ہم کو دیئے ہیں۔ اس کے پیشِ نظر پاکستان کو ایک ایسی ریاست بنانا ہے جو خلافتِ راشدہ کے نمونے پر کام کرے۔

(۲) یہ قطعی ناگزیر ہے کہ اس اسلام پر عمل کیا جائے جس کے نام پر یہ ملک وجود میں آیا تھا۔

(۳) اسلام کے ان تمام احکام کو قانونی حیثیت دینا جو ایک اسلامی مملکت میں رائج ہونے چاہئیں اور خاص طور پر ان اخلاقی برائیوں کو ممنوع قرار دینا جنہیں اسلام از روئے قانون روکنا چاہتا ہے۔

(۴) پچھلی ناہمواریوں کو دور کرنے کے لئے ہم کلیۃً شرعی قوانین پر اعتماد کریں گے۔

(بحوالہ مساوات - مؤرخہ ۱۹/۱۱)

لیجئے۔ اب "کتاب و سنت" کی جگہ "اسلام کے احکام" اور "شرعی قوانین" نے لے لی۔ "کتاب و سنت" میں تو پھر بھی گرفت کی گنجائش تھی۔ اب انہیں کھلی چھٹی مل گئی کہ جس قانون

کو چاہیں "اسلامی" قرار دے دیں؛ اور جسے چاہیں غیر اسلامی۔ جس قانون کو چاہیں شرعی قرار دے کر نافذ کر دیں اور جس شخص کے خلاف چاہیں از رُوئے "شریعت" ارتداد کا فتوےٰ صادر کر کے اسے حوالہ دار و رسن کر دیں۔

صدر ایوب کے آئین میں "اسلام" کی اصطلاح غیر مبہم اور اب ان کے اپنے ہاں وہی اصطلاح نہایت واضح ——— "اسلام پسندی" زندہ باد! ——— "حکمتِ عملی" پائندہ باد!

صفِ ماتم ———

مشرقی پاکستان پر لرزہ انگیز سیلاب کی وجہ سے تباہی اور بربادی کی جو قیامت ٹوٹی ہے اس سے ملک کے ہر گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی ہے۔ ہمارے ہاں بے پناہ غربت اور افلاس کی وجہ سے عید کا تیوہار پہلے ہی ایک رسم سے زیادہ کچھ نہیں رہ گیا۔ لیکن حالیہ تباہی کے پیشِ نظر، اس تقریب پر خوشیاں منانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری درخواست ہے کہ اس تقریب پر ہم جو کچھ بھی زائد خرچ کیا کرتے تھے، اسے سیلاب زدگان کی امداد کے لئے حکومت کے فنڈ میں دے دینا چاہیئے۔ اس میں اس صدقہ فطرانہ کو بھی شامل کر لینا چاہیئے جو نمازِ عید سے پہلے ادا کیا جاتا ہے۔ اس کا اس سے بہتر مصرف اور کیا ہو سکتا ہے۔

جگر فگار

ادارہ طلوعِ اسلام - لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روئداد

طلوعِ اسلام کی تیرہویں سالانہ کنونشن

(منعقدہ لاہور ۲۳-۲۴-۲۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء)

★ ——— مرتبہ: غلام صابر (ایم اے)

ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

مشہور قول ہے کہ انسان کی زبان ہی اس کی شخصیت کا اظہار ہوتی ہے — یعنی اپنے روزمرہ میں جس انداز سے جو جو باتیں اس کی زبان سے نکلیں گی، وہی اس کی شخصیت ہوں گی —!! یہ بات ایک فرد کی ہے — لیکن جب بہت سے افراد میں نظریاتی ہم آہنگی ہو جائے تو پھر ان ہم آہنگ افراد کا طرزِ بود و ماند اور اندازِ گفتار و کردار ایک اجتماعی شخصیت کی پہچان بن جاتا ہے — ملک میں انتخابات کی سرگرمیاں جنون کی حد تک پہنچ چکی ہیں اور ہر طرف عوام کے جذبات کی آگ کو اپنے ذاتی مفادات کے لئے بھڑکایا جا رہا ہے — لیکن جذباتی گھٹاؤں کے اندھیروں میں روشنی کا اہتمام کرنے کے لئے اور گم کردہ راہ کاروانِ ملّت کو نشانِ منزل دکھانے کی آرزو میں رکھنے والے دردمند پیکرانِ مہر و وفا بھی اس خطۂ پاک میں موجود ہیں — وہ اپنے سوزِ دروں سے ملّت کی اجتماعی شخصیت کو استحکام بخشنے کے لئے دل و جان قربان کرنے کے آرزومند ہیں — یہی وہ پیکرانِ مہر و وفا ہیں جو فضا کی ہنگامہ خیزیوں سے بے نیاز اور سیاسی مفادات کی جاذبیتوں سے کنارہ کش — ہر سال طلوعِ اسلام کنونشن میں اس مقصد کو دل میں لے کر جمع ہوتے ہیں کہ یہ خطۂ پاک قرآن کے نظامِ ربوبیت کی آماجگاہ بن جائے اور

اس طرح زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ امسال یہ اجتماع حسبِ معمول ادارہ کے نشیمن ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور میں منعقد ہوا۔

اِن حسین و دلکش اجتماعات کے انتظامات میں بزمِ لاہور کے اراکین کا انہماک دیدنی تھا۔ بزم کے نئے نمائندہ محترم ایم لطیف چوہدری صاحب کی پُرجوش اور ولولہ انگیز طبیعت کی وجہ سے اراکین کی رگوں میں بھی خونِ تازہ پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ موجزن تھا اور وہ سب اپنی اپنی جگہ فرائض سرانجام دے رہے تھے ۔۔۔ کوئی پنڈال کی قناتوں اور شامیانوں کی ترتیب میں مصروف تھا، کوئی مطبخ کا جائزہ لے رہا تھا، اور کوئی مندوبین کے لئے رہائشی انتظامات کے سلسلے میں مصروفِ تگ و تاز تھا۔ اور تحریک کے پرانے کارکن محترم خواجہ محمد حسین صاحب اپنے پُراعتماد اور شگفتہ لب و لہجہ میں تمام ساتھیوں کی حوصلہ افزائی فرما رہے تھے۔

پہلا قافلۂ قرآنی جو کاشانۂ پرویز میں داخل ہوا، وہ احباب کراچی پر مشتمل تھا۔ اتنے دور دراز سفر کی تھکان کے باوجود ان کے چہرے ان کی بلند ہمتوں کی غمازی کر رہے تھے۔ احباب اُن سے گلے ملے اور مطبخ کے قریب ہی مخملی بستر ے بچھا دیئے گئے ۔۔۔ جو لوگ تحریکِ طلوعِ اسلام کے متعلق عجیب و غریب غلط فہمیاں پیدا کرتے رہتے ہیں اے کاش! وہ ایک نظر ان درویشانِ خدامست کو دیکھتے، جو خاک آلود پیشانیوں کے ساتھ اس جذب و انہماک سے فرشِ خاک پر محوِ استراحت تھے۔

یہ ۲۱ر اکتوبر کی صبح تھی۔ شام تک مندوبین کے متعدد اور گروہ بھی مسرت بار قہقہوں کے جلو میں خیمہ گاہ میں وارد ہو گئے۔

آج ۲۳ر اکتوبر ہے۔ ہلکی ہلکی سردی ہے، صبح کا وقت ہے اور احباب اپنے اپنے کیمپوں میں اجلاس میں شمولیت کی تیاری کر رہے ہیں۔ چہروں پر بشاشت اور مسکراہٹوں کا بہتا ہوا دریا ہے ۔۔۔ زندگی کی افسردگیاں، ان کے جوشِ طبیعت سے پناہ مانگتی دکھائی دے رہی ہیں۔ ایک وسیع و عریض پنڈال ادارہ کے سامنے کے سبزہ زار میں نصب ہے جسے آیاتِ قرآنی سے سجایا گیا ہے۔ ابھی ابھی یہ احباب آیاتِ قرآنی کے نیچے بیٹھیں گے اور کنونشن کے پہلے اجتماع کی ابتدا کریں گے ۔۔۔ لیجئے ۔۔۔ لاؤڈ اسپیکر کی گونج فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی ہے اور بزمِ لاہور کے نمائندہ محترم ایم لطیف چوہدری صاحب کاروانِ قرآنی کے شیدائیوں کو آواز دے رہے ہیں۔

پہلا اجلاس

صبح نو بجے ——— بروز جمعہ

زیرِ صدارت محترم محمد اسلام صاحب۔ نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ کراچی

لیجیئے — محترم ظفر احسن محمود صاحب اسٹیج پر آ گئے۔ انہوں نے اراکین کے پہلے اجلاس کی صدارت کے لئے محترم محمد اسلام صاحب کا نام تجویز کیا۔ اور تلاوت کے لئے جواں سال ساتھی، جن کی شب و روز کی کاوشوں سے لائل پور کا قافلۂ قرآنی بڑی تیزی سے تیز تر ہو رہا ہے، محترم حافظ محمد یونس صاحب کا اسمِ گرامی پکارا گیا۔ خدا نے انہیں ایسا لحن عطا کیا ہے کہ جب وہ قرآن پڑھتے ہیں تو فضا میں سا کن صورتِ حال جھومنے لگتی ہے۔ تلاوت کے بعد کاروانِ قرآنی کے دیرینہ ہمسفر جناب مرزا محمد خلیل صاحب نے کلامِ اقبال سے گرمیٔ محفل کا سامان مہیا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کلامِ اقبال ہی وہ معیار ہے جس سے ملّتِ پاکستانیہ کا فکری تشخص ہو سکتا ہے۔ مرزا محمد خلیل صاحب نے اقبال کی یہ مشہور غزل پڑھی اور احباب تڑپ تڑپ گئے۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

کلامِ اقبال کے بعد بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کے سالِ گزشتہ کے نمائندہ محترم ظفر احسن محمود صاحب نے مندوبین کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا۔

> زمانے کے ویران اندھیروں کو پاٹنے کے لئے، ہم سب ہمرکاب ہیں اور ہماری پُر اعتماد اور عظیم الشان جدوجہد سے انقلابِ قرآنی قریب تر ہو رہا ہے — اگرچہ ملک میں حیلہ جو اور موقع پرستوں نے طوائف الملوکی کا غبار اٹھایا ہوا ہے اور یہ غبار فلک بوس اور زمین گیر ہے، لیکن ہمارا یہ طائفۂ کم مایگاں اور قافلۂ آبلہ پایاں، برق سوز اور برق رفتار آندھیوں میں، نورانی بصیرت سے، استقلال و بردباری کے ساتھ فرحاں و خنداں رواں دواں ہے — دعا ہے کہ خدا ہمیں حسبِ وعدۂ قرآنی پر ثبات و استقامت عطا فرمائے اور یہ کرۂ ارض اپنے پیدا کرنے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔

محترم ظفر احسن محمود صاحب کے ولولہ انگیز استقبالیہ کے بعد محترم شیخ الحق صاحب سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی نے سالانہ رپورٹ پیش کی۔ انہوں نے فرمایا کہ

> احباب کا ذوق و شوق حوصلہ افزا ہے۔ اور منزل قریب نظر آ رہی ہے۔ طلوعِ اسلام کالج کی تعمیر کے لئے زمین کے حصول میں جن دقتوں اور مشکلات کا سامنا ہے وہ داستان اگرچہ طویل ہے لیکن ہم اپنی مشکلات پر انشاء اللہ جلد قابو پا لیں گے۔ ظاہر ہے کہ زمین اگر اللہ کی ملکیت ہو تو پھر مسائل پیدا نہیں ہوتے لیکن اگر یہ انسانوں کے قبضے میں چلی جائے تو پھر اسے حاصل کرنے کا مسئلہ جس قدر مشکل ہے، اس سے زیادہ اور کوئی مشکل

کام نہیں

انہوں نے احباب سے اس عظیم الشان منصوبے کی تکمیل کے لئے شب و روز جد و جہد کرنے کی استدعا کی اور امید دلائی کہ ان کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔

قرآنک سوسائٹی کی سالانہ رپورٹ کے بعد ادارہ طلوعِ اسلام کے ناظم محترم طالب حسین صاحب نے سالانہ رپورٹ پیش کی۔ رپورٹ، تحریک کے نظم و نسق سے متعلق مختلف گوشوں کی سال بھر کی جد و جہد کا تفصیلی تعارف کراتی ہوئی، گاہ اراکین تحریک کی گرمجوشیوں کو خراجِ تحسین پیش کرتی اور گاہ ان کی تغافل شعاریوں پر گلہ مند ہوتی، اپنی سبک خرامی سے آگے بڑھتی گئی اور سابقہ تجربوں کی روشنی میں پیش آئند منصوبوں کو سامنے لا کر احباب سے ان کی کامیابی کے لئے تعاون کے وعدے لیتی گئی۔ رپورٹ، تحریک کے فروغ، فکرِ قرآنی کی ہمہ گیر کامیابی اور بزمہائے طلوعِ اسلام کے حسن تعاون کے لئے پیکرِ تشکر و امتنان تھی، احباب نے اس کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ محترم ناظم صاحب نے تحریک کے مخلص ساتھیوں خان عبدالحکیم خان (مردان)، خان بلند اقبال خان (لاہور) اور غلام محمد صاحب (لائل پور) کی بے وقت موت پر بھی اظہارِ تعزیت کیا۔

محترم ظفر احسن محمود صاحب نے محترم پرویز صاحب کا نام پکارا اور پرویز صاحب تالیوں کی گونج میں اسٹیج پر آئے۔ وابستگانِ تحریک کو اپنے سالارِ کارواں کی ذاتِ گرامی سے جس قدر والہانہ محبت ہے اس کا اندازہ ان کی نگاہوں کی چمک اور چہروں کی تابانی سے بخوبی لگ سکتا ہے۔ مودت و احترام کی اس دلربا فضا میں پرویز صاحب نے "سکونِ گہر" کے عنوان سے اپنے خطاب کا آغاز علامہ اقبال کے اس شعر سے کیا کہ

سازی اگر حریف یمِ بے کراں مرا
با اضطرابِ موج سکونِ گہر بدہ

انہوں نے فرمایا کہ

> عمر کی کشتی رواں نے کچھ مہلت دی اور ایک سال کی مفارقت کے بعد آپ سے ہمکلام ہونے کا موقعہ باعثِ سکونِ دل ہوا۔ آپ کے محبت بھرے سینوں کی تمازت، مسکراہٹوں کی لطافت، آپ کے ذوقِ قرآنی کی آئینہ دار اور جذبِ اندرون کی عکاس ہے — یہی میرے زندہ رہنے کا سہارا ہے۔

انہوں نے اپنے استقبالیہ میں ملک کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

> ملک بے پناہ تلاطم خیزیوں اور آندھیوں کے طوفان میں گھرا ہوا ہے اور آتشیں مغاریت کی طرح، یہ شورشیں جہاں سوز ہیں۔ اور ارض پاش زلزلوں کی ہولناک آوازیں اہلِ بصیرت

کے کانوں میں گونج رہی ہیں اور تمام لیڈر اس آتشیں رقص میں ننگے ناچ رہے ہیں۔ لیکن طلوعِ اسلام کا رویہ یہ ہے کہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

یعنی تحریکِ طلوعِ اسلام سکوت و سکون میں، سرکش جذبات کی آندھیوں میں قرآنی بصیرت کے دیئے کو سنبھالے، جذب و مستی سے رواں دواں ہے۔ ہماری یہ دعوت رجعت الی القرآن کی دعوت ہے۔

انہوں نے اپنی عمر بھر کی عرق ریزیوں کا روح پرور ثمر اپنی تصنیف مفہوم القرآن اور لغات القرآن کو قرار دیا۔ اور احباب کو یہ مژدۂ جانفزا سنایا کہ مفہوم القرآن کا مکمل سیٹ شائع ہو چکا ہے۔ یہ خبر اراکین کے لئے چمن خزاں دیدہ میں بہاروں کے لوٹ آنے کی نوید تھی۔ مفکرِ قرآن نے بتایا کہ مفہوم القرآن کا انگریزی ترجمہ بھی مکمل ہو چکا ہے اور اسباب فراہم ہونے پر وہ بھی شائع ہو جائے گا۔ واللہ المستعان۔ آخر میں پرویز صاحب نے لیلائے قرآنی کے ایسے مجنوں کو یاد کیا جس کے جنون نے سرحد کے دشت میں فکرِ قرآنی کی آواز کو عام کر دیا تھا — یعنی خان عبدالحکیم خان (مردان) جو چند ماہ قبل اس قافلۂ قرآنی کو داغِ مفارقت دے گیا تھا — خدا انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ احباب کی آنکھیں خان صاحب کی یاد میں غم آلود تھیں اور پرویز صاحب اپنی بھرائی ہوئی آواز میں تعزیتی الفاظ کا سہارا لے رہے تھے۔

اس طرح یہ اجلاس پُر درد اور رقت آمیز ماحول میں ختم ہوا۔ (یہ خطاب طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکا ہے

کراچی بزم کے سٹال کا افتتاح

پنڈال کے ساتھ ہی کراچی بزم نے ایک وسیع خوبصورت سٹال لگایا تھا۔ اور اس سے ملحق خواتین نے بھی۔ سٹال کا افتتاح کرتے ہوئے پرویز صاحب نے اراکینِ بزم کراچی کے بلند حوصلوں اور قرآن کی نشر و اشاعت کے لئے ان کے نت نئے اسالیب کی تحسین کی اور دعا کی کہ خدا ان کے حوصلوں اور ارادوں میں پختگی عطا فرمائے۔ سٹال کو مختلف خوبصورت اور دلکش چارٹس کے ساتھ سجایا گیا تھا۔ تصاویر کا ایک خوبصورت البم بھی تھا جس میں محترم پرویز صاحب اور دیگر اعیانِ تحریک کی تین سو کے قریب تصاویر تھیں۔ خان عبدالحکیم خان (مرحوم) کی تصویر اور طلبہ داقبال خان (مرحوم) کی تصاویر کے چارٹ دیکھ کر کئی ساتھیوں نے انہیں آہیں بھر کر یاد کیا۔ خواتین کے سٹال میں ان کے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی اشیائے مستعملہ کی خرید و فروخت ہو رہی تھی — اور یہ سب رقم انہوں نے کالج فنڈ میں دے دی۔ قوم کی بیٹیوں میں اگر اس طرح ایثار کے جذبے پیدا ہو جائیں تو یہ خطۂ پاک جنتِ ارضی بن سکتا ہے۔ تمام اراکین اور

شرکائے کنونشن نے کراچی کے اسٹال کی افادیت کو دل سے قبول کیا۔ بزمِ کراچی کے اراکین آئندہ سال اس سٹال میں جدت پیدا کریں گے۔ جیسے ہر سال جدت ہوتی ہے۔ محترم محمد اسلام صاحب نمائندہ بزمِ کراچی اس طرح کے امور میں ساری بزموں کے نمائندوں کے لئے قابلِ رشک ہیں، اور کراچی کی خواتین تمام طاہرہ بیٹیوں کے لئے قندیلِ راہ!

مطبخ والوں نے احباب کو کھانے کے لئے بلایا۔ ابھی کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ مسجد سے جمعہ کی اذان آئی۔ اور احباب نے نمازِ جمعہ کے لئے قریبی مسجدوں کا رُخ کیا۔ جمعہ کی نماز کے بعد کھلے اجلاس سے محترم پرویز صاحب نے خطاب کرنا تھا۔ "قدیم اور جدید کی کشمکش" کیا قانونِ شریعت میں تبدیلی ہوسکتی ہے؟ اس خطاب کا موضوع تھا۔

پہلا کھلا اجلاس

صدارت:۔ ——— محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب

طلوعِ اسلام کنونشن کے کھلے اجلاس خالصۃً فکری ہوتے ہیں۔ اُن میں نہ جذباتی نعرہ بازی ہوتی ہے نہ سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے ہنگامہ آرائی۔ اس طرح ملک کا سنجیدہ اور متین طبقہ ان اجلاسوں میں بکثرت شامل ہوتا ہے اور ملت کے مسائل پر نہایت سنجیدگی اور متانت سے بحث کی جاتی ہے۔ موجودہ ہنگامہ خیز ماحول میں اس قسم کے سنجیدہ اور فکری جلسوں میں عوام کا اس انداز سے حصہ لینا، زرخیزئ حیات کی علامت ہے اور امید کی جاسکتی ہے کہ ملک کے بڑے بڑے مفتنی عناصر جن میں مذہبی پیشوائیت کے علمبردار اور سیاسی جاگیردار بھی شامل ہیں۔ اس ملت کو تعرِ مذلت میں دھکیلنے میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔

یہ اجلاس بعد دوپہر لاہور کی گراں قدر معروف ہستی ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کی صدارت میں شروع ہوا۔ محترم ظفر احسن محمود صاحب نے حافظ محمد یونس صاحب کو تلاوتِ قرآن پاک کے لئے دعوت دی۔ تلاوتِ کلام پاک کے بعد موصوف صدر نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ سائنس کے اصول کے مطابق جب ایک چیز قدیم ہوجاتی ہے تو وہ خود بخود فطرت کے قانون کے مطابق ختم ہوجاتی ہے۔ اور کوئی بھی اس کے بارے میں متفکر نہیں ہوتا بلکہ نئی اشیا کی تزئین کے لئے جد وجہد کی جاتی ہے۔ شکست و ریخت کے اس ارتقائی عمل میں ہر آن تبدیلی کا خیر مقدم کرنا ہی شرفِ انسانیت ہے۔ انہوں نے اپنی بات کو مختلف سائنسی دلائل سے ثابت کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے زیادہ دیر محترم پرویز صاحب اور سامعین کے درمیان حائل نہ ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے فاضلانہ تعارف کو ختم کیا۔

لوگ مفکرِ قرآن کے اس اہم موضوع پر خطاب کو سننے کے لئے بے تاب تھے۔ اس کا انتظار ملک کے قدامت پرست طبقہ کو بھی تھا اور ملائیت سے بیزار طبقہ کو بھی — اس طرح سامعین میں ہر قسم کے افراد کی موجودگی کسی نئے موڑ کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ پرویز صاحب کا نام پکارا گیا اور وہ اپنی دلآویز مسکراہٹ کیساتھ سٹیج پر آئے۔

سامعین نے نہایت متانت اور سنجیدگی سے اس دو گھنٹے کے خطاب کو سنا۔ یونیورسٹی کے ایک طالب علم کے بقول "پرویز صاحب نے ایک وسیع بغاوت قائم کر کے بہت بڑی بات کی ہے۔ اور ان کی یہ جرأتِ رندانہ بہر طور قابلِ ستائش ہے"۔— نئی نسل تو اس پر بہت خوش تھی۔ لیکن قدامت پرست طبقے کے احباب خاموش تھے اور رائے زنی سے بھی اجتناب برت رہے تھے —!! (یہ خطاب طلوعِ اسلام میں شائع ہو جائیگا) یہ کھلا اجلاس ۲ گھنٹے کی طویل نشست کے بعد اختتام پذیر ہوا۔

—— (۰) ——

قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کا اجلاس۔ شام ½ ۵ بجے

جب افراد معاشرہ کے سامنے کوئی عظیم نصب العین ہو تو اُن کی سوچ کے زاویے بھی نصب العین کیمطابق ہو جاتے ہیں۔ اور یوں لگتا ہے کہ ان کی بنیادی پہچان، ان کے نصب العین کے علاوہ کسی دوسری طرح ممکن ہی نہیں۔ احباب کا قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کا عظیم الشان منصوبہ ایک نصب العین بن چکا ہے۔ اس نصب العین کے حصول کے لئے جس جذب و انہماک سے کام کیا جا رہا ہے، اگرچہ بنیادی نقطہ اس سے بھی مطمئن نہیں اور "ہاں اور" کی متقاضی ہے، اور اسی لئے احباب اس رفتار کو تیز سے تیز تر کرنے پر زور دے رہے ہیں۔ لیکن ذمہ دار احباب، جوش و جذبہ کو سراہنے کے باوجود کسی ایسے عاجلانہ اقدام کے لئے آمادہ نہیں تھے جس کی عدم تکمیل پر انہیں معذرت خواہ ہونا پڑے اس لئے وہ احباب سے مزید اعانت کے خواستگار رہے۔ بہر حال خوشگوار ماحول میں یہ محفل نئے حوصلوں کے ساتھ جاری رہی۔ چونکہ کالج کے لئے زمین خریدنے کا معاملہ "احباب کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی" کی وساطت سے طے پا رہا ہے۔ اس لئے سوسائٹی کے سیکرٹری محترم ظفر احسن محمود صاحب نے سوسائٹی کے اجلاس میں جو رپورٹ پیش کی اس کے مندرجات سے اراکین بزمہائے طلوعِ اسلام کو بھی مطلع کیا گیا تاکہ انہیں معلوم ہو سکے کہ اس سلسلہ میں متعلقہ حضرات کیا جد و جہد کر رہے ہیں ہیں۔

یہ محفل قریب ½ ۶ بجے ختم ہوئی۔ اسی شام ایک دلچسپ ڈرامہ بزم کراچی کے احباب نے پیش کرنا تھا — احباب نے کھانے کے بعد دوبارہ پنڈال کی راہ لی۔

—— (۰) ——

بزمِ کراچی کا پروگرام

ڈرامہ: "علاج اس کا......"

رات کے ۱۱ بجے ہیں۔ دن بھر کی مصروفیات اور گوناگوں ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو کر احباب کراچی نے ایک نہایت فکر آمیز اور سبق آموز تفریح کے لئے چند لمحات کو مختص کر لیا ہے۔ اراکینِ بزمِ کراچی کے ولولے اور حوصلوں کی پختگی قابلِ داد ہے۔ کنونشن کے سب پروگرام ملت کو تدبر و تفکر پر آمادہ کرتے ہیں۔ غالب خیال یہ کیا جاتا ہے کہ ڈرامہ محض تفریحِ طبع کے لئے اسٹیج کیا جاتا ہے۔ لیکن بزمِ کراچی کے ڈرامہ نگار اور ملک کے عمومی ڈرامہ نگاروں میں نمایاں خطِ امتیاز یہ ہے کہ بزمِ کراچی کا ڈرامہ ایک بلند و بالا نصب العین کو سامنے رکھ کر اسٹیج کیا جاتا ہے اور اس طرح اہلِ فن کے سامنے ایک نہایت خوش آئند نمونہ پیش کیا جاتا ہے اور ناظرین کو بتایا جاتا ہے کہ فن کس طرح دین کی خدمت کر سکتا ہے۔

بزمِ کراچی کا ڈرامہ "علاج اس کا......" آوارگی نہیں بلکہ ایک سفر ہے جو جادۂ قرآنی کو طے کرتا ہوا ربوبیتِ عامہ کی منزل تک پہنچتا ہے۔ اس ڈرامے کا ہیرو سلیم ہے جسے مطالعہ کا شوق ہے اور وہ زندگی کے بارے میں سوچنے کا عادی ہے۔ المناک اور دردناک زندگی کی کیفیت، اُسے ذہنی پریشانیوں کا شکار کر دیتی ہے — مذہب پرست طبقہ جو گھر ہی کے قریبی بزرگ ہوتے ہیں وہ سلیم کے اس طرح مطالعہ کرنے اور زندگی کے حقیقی موضوعات پر سوچنے سے منع کرتے ہیں — وہ خوفناک صورتِ حال سے مایوس ہوتا ہے — اور خودکشی کر لیتا ہے۔ لیکن بروقت طبی امداد مل جانے کی وجہ سے بچ جاتا ہے۔ لیکن وہ زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ اُس کا معالج ڈاکٹر، اس کا قریبی دوست ہے۔ وہ اس سے خودکشی کی وجہ پوچھتا ہے — سلیم اپنے المیوں کی طویل داستان دردبھرے انداز میں بتاتا ہے۔ ڈاکٹر پورے غور سے اس کی باتوں کو سنتا ہے اور موجودہ مذہب کے توہمات کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے زندگی گزارنے کا حل پیش کرتا ہے — مذہب کی فرسودہ کیفیت واقعی موجودہ ماحول کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی اور حیاتِ انسانی کو صحیح اور مکمل اصولی راہنمائی اگر مل سکتی ہے تو وہ قرآن کی بارگاہ ہے — ڈاکٹر سلیم کی الجھنوں کو سلجھاتے ہوئے عالمگیر انسانیت کی بہتری اور بھلائی کی تعلیم دیتا ہے — سلیم ڈاکٹر کے پیش کردہ حقائق سے متاثر ہو کر قرآن کی طرف رجوع کرتا ہے اور موجودہ دور کے مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کی کتب کا بغور مطالعہ کرتا ہے اور پھر دل و دماغ کی کامل رضامندی سے علیٰ وجہ البصیرت قرآن کی حقانیت پر ایمان لاتا ہے۔ اور جذبات سے ہٹ کر قرآن کے پیغام کو دنیا میں پھیلانے کے لئے مصمم ارادہ کر لیتا ہے اور یہی اس کی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے اور اُسے زندہ رہنے کا ڈھب آ جاتا ہے — یہی اس کی بیماریوں کا علاج تھا۔ یعنی بقولِ اقبالؒ ؎

علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

ڈرامہ سامعین کی پرجوش تالیوں سے ختم ہوا۔ اور پنڈال میں روشنیاں واپس آگئیں۔ پرویز صاحب سٹیج پر آئے، مائیک سنبھالا اور یوں گویا ہوئے کہ

> برادران عزیز! بزم کراچی کا ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ ہے۔ وہ اپنی بے سروسامانی کے باوجود اپنے جذبہ صادقہ سے قرآنی تعلیم کی اشاعت کے لئے نئی نئی راہیں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ایک شاہراہ پر پہنچنے کے لئے کئی ایک پگڈنڈیاں یعنی چھوٹے چھوٹے راستے ہوتے ہیں۔ ان پگڈنڈیوں کو "سبیل" کہا جاتا ہے۔ بزم کراچی کے احباب اپنی فکری کاوشوں سے شاہراہ قرآنی پر پہنچنے کے لئے نئے نئے سبل اختیار کرتے ہیں۔ جو لائق تہنیت و تبریک ہیں۔ خدا ان کے حوصلوں میں برکت دے اور یہ قرآن کے شیدائی نئی نئی راہوں سے قرآن کی آواز کو دور دور تک پھیلانے میں کامیاب ہوں۔ خدا ان کا حامی و ناصر ہو۔

رات کا کافی حصہ گذر چکا تھا۔ اس طرح بزم کراچی نے پرویز صاحب کے پرجوش خراج تحسین و آفرین کے بعد ڈرامے کے ختم ہونے کا اعلان کیا اور سامعین کا شکریہ محترم محمد اسلام صاحب نے ادا کیا۔

درس قرآن بذریعہ ٹیپ ریکارڈ

بزمہائے طلوع اسلام کا مقصد وحید قرآن کریم کی تعلیمات کو عام کرنا ہے۔ اس کے لئے انفرادی سطح سے لے کر اخبار، کتاب اور گفتگو تک کو ذریعہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مفکر قرآن محترم پرویز صاحب کے ہفتہ وار درس قرآن کے سلسلہ کو ملک گیر حد تک پھیلانے کے لئے ٹیپ کا طریق کار اختیار کیا گیا ہے اور ملک کے قریباً ہر بڑے شہر میں پرویز صاحب کا درس قرآن سنایا جاتا ہے۔ ڈرامہ کے بعد ان بزموں کے نمائندگان کا ایک خصوصی اجلاس اس مقصد کے لئے منعقد ہوا کہ اس طریق کار کو زیادہ سے زیادہ منفعت بخش بنانے کے لئے کیا اقدامات کئے جائیں۔ مقصد کی اہمیت کے پیش نظر خود پرویز صاحب بھی شریک اجلاس رہے اور مختلف گوشوں پر ارباب نظم و نسق کی رہنمائی فرماتے رہے۔ نصف شب کے قریب یہ نہایت مفید محفل اختتام پذیر ہوئی۔

---

۲۴ راکتوبر - بروز ہفتہ

صبح ۹ بجے ——— زیر صدارت ——— نذیر حسین عارف

کل سارا دن مصروفیات میں گزرا اور رات گئے تک جاگتے رہنے کی وجہ سے اعصاب پر تھوڑا سا اثر تھا لیکن ساتھیوں کے جوش و خروش کو دیکھ کر تھکے ہوئے اعصاب میں بھی نئی زندگی دوڑ آتی تھی۔ بزمیں آج ایسی تجاویز اور مشورے پیش کریں گی جن سے تحریکِ طلوعِ اسلام کے پیغام کو زیادہ سے زیادہ مؤثر انداز سے پھیلایا جا سکے۔ احباب صبح اٹھے۔ قریبی مسجدوں میں نمازِ فجر ادا کی اور پھر واپس آ کر صبح کے اجلاس میں تجاویز پیش کرنے کے بارے میں غور و فکر کرنے لگے۔ ٹی سٹال پر ناشتہ کیا گیا۔ خوشیوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر قلب و روح کے لئے باعثِ اطمینان بنا ہوا تھا۔ ادھر چائے پر دنیا جہان کے موضوعات پر تبادلۂ خیالات کیا جا رہا تھا۔ اسی دوران پنڈال سے بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کے جواں ہمت نمائندہ محترم ایم لطیف چوہدری صاحب نے اعلان فرمایا کہ اجلاس شروع ہونے والا ہے لہٰذا احباب پنڈال میں تشریف لے آئیں۔ نمائندہ صاحب کی آواز سنتے ہی خوش گپیاں ختم ہو گئیں اور احباب نے پنڈال کی راہ لی۔

یہ اجلاس لائل پور کی ہر دلعزیز شخصیت اور نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام محترم نذیر حسین عارف صاحب کی زیرِ صدارت شروع ہوا۔ تلاوتِ قرآنِ مجید محترم حافظ محمد یونس صاحب نے فرمائی۔ کلامِ اقبال جناب مرزا محمد خلیل صاحب نے سنایا اور جذب و کیف کا نیا سماں پیدا کر دیا۔ تجاویز کا دور شروع ہوا۔ تحریک کے کارکنوں کی امنگوں اور آرزوؤں کا اگر پتہ لگانا ہو تو وہ ان کی تجاویز سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان تجاویز کا انداز کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو، لیکن یہ گردش کرتی ہیں ایک ہی محور کے گرد۔ اور وہ محور ہے "فکرِ قرآنی کی نشر و اشاعت"۔

اشاعتی اسکیم

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ماہنامہ طلوعِ اسلام کی اشاعتی اسکیم دوبارہ زیرِ غور آئی۔ اور بزموں نے نہایت خندہ پیشانی سے اعلان کیا کہ اس سلسلہ میں جس قدر ذمہ داریاں انہوں نے اپنے سر پہلے رکھی ہیں، وہ اس میں کوئی کمی نہیں کریں گی اور بدل و جان اسے پورا کریں گی۔ لہٰذا اس اسکیم کو علیٰ حالہ جاری رکھا جائے۔ بزموں کا یہ تجدیدِ عہد بڑا خوش آیند اور حوصلہ پرور تھا۔

پمفلٹس اسکیم

اس کے ساتھ ہی یہ تجویز سامنے لائی گئی کہ طلوعِ اسلام میں جو بھی اہم مقالہ شائع ہو اور اس قسم کے مقالات اس کی قریب قریب ہر اشاعت میں موجود ہوتے ہیں۔ انہیں التزاماً الگ پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا جائے اور ان پمفلٹوں کی اشاعت کا سلسلہ زیادہ سے زیادہ وسیع کیا جائے۔ اس سے ملک کی فضا قرآنی فکر سے معمور ہو جائے گی اور منزل قریب تر آ جائے گی۔ بزموں نے اس تجویز کا والہانہ استقبال کیا اور اس سلسلہ میں اپنی اپنی ذمہ داریوں کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلانات بڑے ہمت افزا تھے۔

ادارہ کے لئے ٹیپ ریکارڈرز

پرویز صاحب کے درسِ قرآن کی ترویج کا پروگرام اس قدر کامیاب

ثابت ہوا ہے کہ احباب اسے زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ٹیپ ریکارڈرز اس درس کے لئے رگِ جان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ناظمِ ادارہ نے بتایا کہ جو دو ٹیپ ریکارڈرز اس وقت پرویز صاحب کے درس کو ریکارڈ کرتے ہیں وہ بہت پرانے ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ نئے ریکارڈرز کی ضرورت اشد ہے۔ اس پر ایک نئے ریکارڈر کا ذمہ ان بزموں نے خصوصی طور سے لیا جن کے ہاں درس سنانے کا اہتمام ہے اور دوسرے ریکارڈر کے لئے عام بزموں نے پیشکش کر دی۔

واضح رہے کہ طلوعِ اسلام کی بزموں کے اراکین کی اکثریت ان محنت کشوں پر مشتمل ہے جو اپنی کمائی سے بمشکل اپنا گزارہ چلا سکتے ہیں۔ ان میں کچھ حضرات یوں کہیے کہ متوسط طبقہ سے متعلق ہیں۔ سرمایہ داران میں ایک بھی نہیں، — جو تحریک نظامِ سرمایہ داری کی سب سے بڑی دشمن ہو، اور جنت فروشی کے فریب سے کسی سے کچھ مانگنا گناہِ عظیم قرار دیتی ہو، اس میں کوئی سرمایہ دار کیسے شریک ہو سکتا ہے۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں جس قدر اسکیمیں روبہ عمل لائی جاتی ہیں، ان سب کا بوجھ انہی غریبوں اور "سفید پوشوں" کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اور اپنی بے سروسامانی اور بے مائیگی کے باوجود، یہ دل کے غنی جس خندہ پیشانی سے اس کی ہر اسکیم کا استقبال کرتے ہیں، اس پر سرمایہ داری کی ہزار بخشائشیں قربان کی جا سکتی ہیں۔

آزادیٔ رائے

ایک تجویز یہ پیش ہوئی کہ جس دن پرویز صاحب کے درسِ قرآن کریم کا آغاز ہوا تھا، اس کی یاد خاص طور پر منائی جایا کرے تاکہ قوم کو معلوم ہو کہ تیرہ سو سال کے بعد خالص فکرِ قرآنی کی آواز کب کہے اور کہاں سے بلند ہوئی تھی۔ کچھ احباب اس تجویز کے مؤید تھے لیکن بعض احباب کی طرف سے یہ ترمیم پیش کی گئی کہ ایک الگ تقریب منانے کے بجائے، کیوں نہ اسے اس جشنِ نزولِ قرآن ہی کا ایک حصہ قرار دے دیا جائے۔ جسے ہم ہر سال (عید الفطر کے موقع پر) مناتے ہیں۔ اس سے یہ تجویز بحث و نزاع کا موضوع بن گئی تو ایک صاحب نے پرویز صاحب سے کہا کہ وہ اس باب میں اپنی رائے کا اظہار فرما دیں تاکہ یہ بحث ختم ہو جائے۔ اس پر پرویز صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ ہماری تحریک کی انفرادیت کے لئے دلیلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ

> میں آپ نمائندگان کے اجلاس میں بہ حیثیت ایک مبصر کے شریک ہوتا ہوں میں نہیں چاہتا کہ کسی ایسے مسئلہ پر جس میں اختلافِ رائے ہو، اپنی رائے دے کر آپ احباب کی حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے پر پابندی لگا دوں۔ آپ اس تجویز پر آزادانہ بحث کریں اور موافق و مخالف دلائل کی رو سے کسی نتیجہ پر پہنچیں۔

اس دور میں، جب کم و بیش ہر تحریک کا سربراہ، بالواسطہ یا بلاواسطہ، ڈکٹیٹر کی پوزیشن اختیار کر لیتا ہے، پرویز صاحب کا یہ انداز، ہم وابستگانِ فکرِ قرآنی کے سامنے حریتِ فکر و نظر کی کشادہ راہیں روشن کر دیتا ہے۔

(۰)

تجاویز کا دور ختم ہوا، اور قراردادیں پیش کی گئیں۔ ان قرار دادوں کی تفصیل طلوع اسلام میں شائع ہوگی، اسلئے ان کا مذکرہ نہیں کیا جا رہا۔

یہ اجلاس ختم ہونے سے پہلے محترم پرویز صاحب نے صاحب صدر کی اجازت سے فرمایا کہ آج بعد دوپہر بزم مذکرہ کا کھلا اجلاس ہونے والا ہے۔ اس میں قوم کے سلیم بیٹوں کے علاوہ ملت کی طاہرہ بیٹیاں بھی شامل ہوں گی۔ مجھے امید ہے کہ آپ احباب اپنی سابقہ روایات کے مطابق آداب محفل اور احترام نسائیت کے برقرار رکھنے کے لئے چشم کشا رہیں گے۔ پرویز صاحب کی اس مختصر اپیل کے بعد صاحب صدر نے اجلاس ختم کرنے کا اعلان فرمایا۔ دوپہر ہو چکی تھی — احباب کو مطبخ والوں نے آواز دی اور کھانا شروع ہوا۔

بزم مذاکرہ

"اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے"

طلوع اسلام کنونشن کا یہ کھلا اجلاس ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ملک کا نوجوان طبقہ اپنے خیالات، احساسات اور تصورات کا اظہار کرتا ہے — اس میں قوم کے بیٹے بھی ہوتے ہیں اور بیٹیاں بھی — مؤدت و احترام کی فضا اس مذاکرہ کے منفرد ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

پرویز صاحب بنفسِ نفیس اس اجلاس کے اسٹیج سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ اس سے اُن کی نئی نسل سے اُمیدیں وابستہ کرنے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اجلاس تحریک طلوع اسلام کے فاضل رکن محترم حسن عباس رضوی صاحب کے زیر صدارت شروع ہوا۔ محترم پرویز صاحب نے تمہیداً کہا کہ قوموں کی تقدیر اس کی ابھرتی ہوئی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جو قوم اپنے نونہالوں کو سنبھال نہیں سکتی وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جایا کرتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بزم مذاکرہ کے عنوان کا انتخاب یہ نوجوان خود کرتے ہیں — قوم اس وقت جس خلفشار سے دوچار ہے اس کے پیش نظر ان نوجوانوں نے اپنے لئے علامہ اقبال کا یہ مصرعہ منتخب کیا ہے کہ

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!

اس مذاکرے میں قوم کے بیٹوں کے علاوہ ملت کی بیٹیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔ اور جو ملت اپنی بیٹیوں کا احترام کرنا جانتی ہے وہ تہذیب کے بام ثریا کو چھو لیتی ہے — ہمیں بیٹیوں کا احترام کرنا خود حضور نبی اکرمؐ نے سکھایا ہے۔ حضورؐ احتراماً اٹھنے کو منع فرماتے تھے۔ لیکن جب حضرت فاطمہؓ تشریف لاتیں تو آپ اٹھ کھڑے ہوتے تھے — یہ

سب بیٹیوں کا احترام ہے ۔۔ لہٰذا اس محفل میں کوئی نازیبا حرکت تو ایک طرف نگاہوں کی بے باکی اور آنکھوں کی جنبش تک بھی خلافِ شرفِ انسانیت متصور نہ ہو گی ۔۔۔ پرویز صاحب نے اس تمہید کے بعد لاہور کے مشہور و معروف علمی گھرانے خلیفہ شجاع الدین (مرحوم) کی چشم و چراغ گلشنِ قرآنی کی عندلیب اور محفلِ قرآنی کی طاہرہ بچی، ثریا عندلیب کو تلاوتِ قرآن کی دعوت دی۔ اور انہوں نے تلاوت سے محفل کو آئینہ پوش بنا دیا۔ تلاوتِ قرآن کے بعد قافلۂ قرآنی کے ہدی خواں پیکرِ خلت، محترم مرزا محمد خلیل صاحب کو کلامِ اقبال پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے اقبال کی اسی نظم کے اشعار سنائے جو اس مذاکرے کا موضوع تھا۔

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

محترم خلیل صاحب نے ان اشعار کو اس لے میں پڑھا کہ کئی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اشکوں کی اس جھلمل میں مفکرِ قرآن نے عزیزہ سلمٰی لطیف کا نام پکارا ۔۔۔ اس ننھی سی بچی نے جس پُراعتماد طریق سے اپنے احساسات کا اظہار کیا، وہ ہم بڑوں کے لئے بھی قابلِ رشک تھا۔ اس کا مسئلہ یہ تھا کہ اُن کے والد صاحب نماز کسی اور طرح پڑھتے ہیں، ان کی سہیلی فرزانہ کے ابا جی کسی اور انداز سے اور محلے کے مولوی صاحب کا اپنا ہی انداز ہے۔ ان تینوں میں باہمی اختلاف ہے۔ اور وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے اس بارے میں بات کرنے پر منع کرتے ہیں ۔۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ اس مسئلے کا حل آپ بتائیں تاکہ فرزانہ کی دوستی قائم رہ سکے ۔۔۔ ! ہمارے معاشرے کا کس قدر سنگین مسئلہ تھا جس کی طرف اس معصوم بچی نے اشارہ کیا۔ کاش ہمارے ملک کے راہنما نئی نسل کی تعلیمی اور تربیتی بنیادوں کا جائزہ لیں اور اس انتشار کو ختم کریں۔

اس کے بعد سلیم عبدالقیوم صاحب نے ملک کی معاشی صورتِ حال کا تذکرہ کیا اور کہا کہ جب تک ملک کی معاشی صورتِ حال کو تبدیل کر کے نظامِ ربوبیت قائم نہیں کیا جاتا اس وقت تک نئی نسل کی صحیح تربیت نہیں ہو سکتی۔

ثریا عندلیب صاحبہ نے اپنے نہایت حقیقت کشا مقالے میں معاشرے کی برائیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ زندگی ایک جہنم بن چکی ہے اور انسان حیوانوں سے بھی گئے گذرے ہیں۔ پاکستان کی مملکت کا قیام اس لئے نہیں تھا کہ یہاں بدی کا دور دورہ ہو اور قرآنی تعلیمات پر کوئی عمل نہ کرے۔ موجودہ دور میں مسلمان کی منزل، نظامِ قرآنی کے قیام کے علاوہ کچھ نہیں کہ

یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

خالد محمود سیّد جنہوں نے مشرق میں شعور کی آنکھ کھولی لیکن مغرب میں عمر کا ایک حصّہ گزارا، وہ معاشرہ میں قول و فعل کے تضاد کی اصل وجہ تلاش کر رہے تھے اور سراپا سوال بنے ہوئے تھے۔

غلام صابر قائم الرحمٰن نے ملائیت اور سرمایہ داروں کی اخلاقیات کو ہدفِ تنقید بنایا۔ اس کے بعد خالدہ عندلیب نے معاشرے میں عورت کی مظلومیت کا ایسا دردناک منظر پیش کیا کہ وہ خود بھی روئی اور لوگوں کو بھی رُلایا۔ ان کے شکوے کا جواب، اُن کے بھائی خالد لطیف نے دیا کہ قرآن کا نظام عورت کی مظلومیت کو ختم کر دیتا ہے۔

محمد احمد نے معاشرے میں فرقہ بندی اور نفرت کی خرابیوں کا تذکرہ کیا۔ عزیزہ نوشابہ نے قوم میں سلامتیٔ فکر کے ساتھ ساتھ حسنِ کردار پر زور دیا۔ یعنی

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

محترم پرویز صاحب نے مذاکرے کی پہلی نشست کو نمازِ عصر اور مغرب کی ادائیگی کے لئے ختم کیا اور دوسری نشست ۶ بجے شروع کرنے کا اعلان فرمایا۔ دوسری نشست کی ابتدا گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم شاہد امین حیدر نے کی اور مسلکِ خانقاہیت کو ختم کرنے پر زور دیا۔ مسرت چغتائی صاحبہ نے ملک کے عمومی تربیتی نظام کی جانب توجہ دلائی۔ شوکت پرویز نے مسجدوں میں وہابی، بریلوی ہونے کی اذیت ناک کیفیت کو خوبصورت مثال سے واضح کیا۔ خاور رشید بٹ نے طلباء کی بے راہ روی کو ملک کے نظامِ تعلیم کی خرابی میں تلاش کیا اور بتایا کہ یہ نظامِ تعلیم مسلمان پیدا نہیں کر سکتا۔ مذاکرہ کی فاضل مقررہ محترمہ عارفہ سلطانہ صاحبہ نے مسلمانوں کی تاریخ کو جس رنگ میں اسے ہماری کتابوں میں پیش کیا گیا ہے، نوجوان نسل کے دین سے برگشتہ ہونے کی بنیادی علت قرار دیا۔ اس کے بعد کاشانہ پرویز کی دو بچیاں نجمہ اور سلمٰی پرویز نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پھر مقررِ خطبۂ صدارت میں محترم حسن عباس رضوی صاحب نے کہا کہ

"اگر ہماری نئی نسل اسی طرح اپنے عمل کا احتساب کرتی رہی تو پاکستان ایک نہ ایک دن ضرور خدا کے نور سے جگمگا اٹھے گا۔"

اس کے بعد سلمٰی لطیف، خالدہ عندلیب، شوکت پرویز کو انعامات دیئے گئے لیکن انہوں نے یہ ساری رقم کالج فنڈ میں دے دی۔ اور اس طرح یہ حسین و جمیل محفل ختم ہوئی۔

اس قسم کے مذاکروں کا اہتمام اگر ملک کی درس گاہوں میں کیا جائے تو اس کے نتائج بڑے ہی دور رس ہو سکتے ہیں۔ ارباب نظامِ تعلیم کو اس سلسلے میں خصوصی مشورے دینے چاہئیں تاکہ وہ اس طرح کی محفلوں سے نظر و فکر میں وسعت اور گہرائی پیدا کر سکیں۔

اعلان کیا گیا کہ ۸½ بجے ایک کھلا اجلاس ہوگا یعنی "مجلسِ استفسارات" یہ محفل کنونشن کے اجتماعات میں جہاں بصیرت افروز ہوتی ہے وہاں شگفتگی و شادابی کی لالہ زار بھی — اراکین کو طلوع والوں نے دعوت دی — احباب نے کھانا کھایا اور دوبارہ پنڈال میں آبیٹھے۔ تاکہ اس کھلے اجلاس میں جگہ کی کمی لطف اندوزی پر بار نہ بنے۔ (مذاکرہ کی تقاریر طلوعِ اسلام میں شائع ہو جائیں گی۔)

مجلسِ استفسارات

رات ہو چکی ہے۔ ہلکی ہلکی سردی ہے۔ وسیع و عریض پنڈال لوگوں سے بھر چکا ہے اور مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب نیز روشنیوں کے جلو میں اسٹیج پر آ چکے ہیں۔ اس محفل کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ پرویز صاحب سامعین کی طرف سے پیش کردہ سوالات کا جواب قرآن کی روشنی میں پیش کرتے ہیں لیکن ان کے جوابات زاہدِ خشک کی طرح نہیں ہوتے بلکہ وہ اس میں شائستہ طنز و مزاح کو اس خوبی سے گھول دیتے ہیں کہ بات سیدھی دل میں بھی اُتر جاتی ہے اور جس پر چوٹ پڑتی ہے وہ بھی ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس طرح عرب کے حسنِ طبیعت اور عجم کے سوزِ دروں کا حسین امتزاج فکری افق پر نہایت دلکش قوسِ قزح کی نمود کا باعث بن جاتا ہے۔

یہ بات سچ ہے کہ اگر کسی نے پرویز صاحب کی تخلیقی صلاحیتوں کا جائزہ لینا ہو، تو وہ اس محفل میں شمولیت کرے۔ وہ ایک عمیق مفکر کی طرح مسائلِ حیات کی گہرائیوں میں بھی اترتے ہیں اور ایک سچے فنکار کی طرح سامعین کے احساسات پر نگاہ رکھتے ہوئے، سنجیدہ موضوعات پر خون کے آنسو بھی رُلاتے ہیں اور قہقہوں کے جام بھی لنڈھاتے ہیں۔ انہوں نے سلسلۂ کلام کو شروع کرتے ہوئے کہا کہ

> یہ محفل گھریلو قسم کی ہوتی ہے جس میں اجنبیت اور غیریت نہیں ہوتی۔ میں آپ کے سوالات کے جوابات قرآن کی روشنی میں اپنی بصیرت کے مطابق دوں گا۔ میں قرآن کا ادنیٰ طالب علم ہوں اس لئے میرے جوابات میں سہو و خطا کا امکان ہو سکتا ہے۔ اگر آپ میرے جواب سے مطمئن ہوں تو ھوالمراد۔ اگر کوئی گوشہ تشنہ رہ جائے تو آپ مجھ سے بذریعہ خط دریافت فرمالیں یا مجھ سے ملاقات کا وقت لے لیں۔ باہمی تبادلۂ خیالات سے افہام و تفہیم میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

انہوں نے ایک ایک سوال کو پڑھا اور جن کے جوابات دینے تھے، انہیں الگ رکھ لیا اور بتایا کہ اکثر سوالات ایسے ہیں جو اس دنیا سے متعلق نہیں، اگلی دنیا سے متعلق ہیں — لہٰذا اُن کے جوابات تو اُس دنیا میں ہی جا کر دوں گا۔

دسعت اِس دنیا کی باتیں کرتا ہوں اور اُن سوالات کا جواب دیتا ہوں جن کا تعلق ہماری عملی دنیا سے ہے۔ اس کے بعد انہوں نے سوالات کے جواب دینے شروع کئے اور اس عجز کا اعتراف مجھے ہی نہیں بلکہ جن قلمکاروں نے گزشتہ کنونشنوں کے روئداد مرتب کی تھی، وہ بھی اس اعتراف میں میرے شریک رہے ہیں کہ اس محفل کی روئداد پیش کرنا کسی کے بس کی بات نہیں سینکڑوں سوالات، اور ایک ایک سوال کے جواب میں بات سے بات نکلتی ہوئی سینکڑوں ہی گوشوں کو سمیٹتی چلی جاتی ہے — سفینہ چاہیئے اس بحرِ بے کراں کے لئے! — لہٰذا میں اس معذرت کے ساتھ آگے بڑھتا ہوں۔

سامعین پرویز صاحب کی باتوں سے محظوظ ہو رہے تھے کہ اچانک انہوں نے اعلان کیا لیجئے رات کے ۱۱½ بج گئے۔ لوگوں نے اپنی اپنی گھڑیوں کو دیکھا — اور تعجب سے دیکھا — واقعی رات ۱۱½ بجے کا وقت تھا۔ سچ ہے کہ جب دل و دماغ کی گہرائیوں سے کوئی کام جذب و شوق سے کیا جائے تو وقت کا احساس ختم ہو جاتا ہے —

بادلِ ناخواستہ لوگ پنڈال سے اٹھے، یہ کہتے ہوئے کہ کاش پرویز صاحب اس محفل کو زیادہ طویل بنائیں۔

صبح ۹½ بجے مفکرِ قرآن کا اہم خطاب تھا جس کا عنوان تھا ”قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں“ صبح کے اس اجلاس میں شرکت کی آرزوئیں لئے ہوئے اراکین اپنی اپنی خوابگاہوں میں چلے گئے، اور اس طرح مجلسِ استفسارات، رات گئے تک جاری رہنے کے بعد بحسن و خوبی اختتام پذیر ہوئی۔

کھلا اجلاس

۲۵ اکتوبر — بروز اتوار — صبح ۹½ بجے

صدارت: ڈاکٹر محمد حیات ملک صاحب

زندگی کے معمولات میں اگر تنوع پیدا ہوتا رہے تو مصروفیات بار گراں محسوس نہیں ہوتیں بلکہ انسان ان مصروفیات کو مقصد زندگی سمجھتے ہوئے بڑے جذب و انہماک سے سعی و عمل میں مصروف رہتا ہے اور نتائج بھی خوشگوار ہوتے ہیں۔ اور اگر زندگی کی ہر آن بدلتی ہوئی صورتِ حال کے ساتھ ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوا جاتا تو پھر اجتماعی طور پر مایوسی پیدا ہوگی اور مایوسی کی دوسری شکل بغاوت اور ہنگامہ آرائی ہے۔ جذبات عقل پر غالب آجاتے ہیں۔ تحریک طلوع اسلام کا مشن یہ ہے کہ انسان غیر متبدل اصولوں کا دامن تھامے ہوئے، زندگی کی بدلتی ہوئی کیفیات کا ساتھ دے اور انتشار سے دوچار نہ ہو۔ اس قسم کی ذہنی کیفیات کے ساتھ اراکین پنڈال میں داخل ہو رہے تھے۔ آج مفکرِ قرآن کا اہم خطاب تھا اور موجودہ سیاسی ہنگامہ آرائیوں کا تجزیہ پیش کیا جانا تھا۔ ظاہر ہے کہ ملک کے سیاسی حلقوں کو بھی اس سے دلچسپی تھی اور دن بھی ہفتہ وار چھٹی کا تھا، اس لئے پنڈال وقت سے پہلے ہی بھر گیا۔ اس اجلاس کی

صدارت لائل پور کے ڈاکٹر محمد حیات ملک صاحب نے فرمائی ـــ موصوف نہ صرف ایک معزز شہری ہیں بلکہ بزمِ طلوعِ اسلام لائل پور کے قابلِ فخر رکن بھی ہیں۔ محترم ظفر احسن محمود صاحب نے تلاوتِ کلامِ پاک کے لئے محترم خواجہ محمد معظم صاحب کو دعوت دی۔ گہرے نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس، سرخ وسفید رنگ کا یہ نوجوان ـــ تلاوتِ قرآن پاک کے لئے اسٹیج پر آیا ـــ مذہب زدہ لوگ' اس طرح کے نوجوانوں کو ملتے پر نیوڑیوں کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ لیکن انہیں کیا خبر کہ اب یہ نوجوان قرآن کے کس طرح کے شیدائی ہیں اور ان کے قلب و دماغ میں دین کس طرح رچ بس چکا ہے ـــ خواجہ محمد معظم صاحب نے تلاوت کی اور دلوں میں ولولے پیدا ہو گئے۔

تلاوتِ قرآن مجید کے بعد محترم محمد اسلام صاحب نے 'طلوعِ اسلام تحریک کے تعارف کے موضوع پر ایک پُر مغز اور فاضلانہ مقالہ پڑھا جس میں تاریخی و تہذیبی معلومات بھی تھیں اور اس تناظر میں اپنے موقف کے اظہار کا فاضلانہ طریقہ بھی۔ (یہ مقالہ طلوعِ اسلام کی اشاعتوں کی شامل کر دیا جائے گا۔)

محترم اسلام صاحب کے حقیقت کشا مقالے کے بعد تحریکِ طلوعِ اسلام کے دیرینہ ساتھی محترم چوہدری عطاء اللہ صاحب (ساہیوال) نے اپنا مقالہ "لخت لخت" پڑھا۔ جو زندگی کے مسائل پر ایک دیدہ ور کا مشاہدہ تھا۔ سامعین نے دورانِ مقالہ کئی بار پُرجوش تالیوں سے تحسین و آفرین کی ـــ (یہ دل افروز مقالہ طلوعِ اسلام کی آئندہ اشاعتوں میں شائع کر دیا جائے گا)۔ اس کے بعد صاحبِ تحریک کے دیرینہ رفیق شیخ سراج الحق صاحب نے طلوعِ اسلام کالج کا مختصراً تعارف کرایا۔

لیجئے اب وہ وقت بھی آگیا جس کے لئے سامعین ہمہ تن انتظار تھے۔ یعنی مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کا خطاب۔ ان کا موضوع تھا۔ "قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں"۔ عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ پرویز صاحب ملک کی موجودہ صورتِ حال کے بارے میں اظہارِ خیالات فرمائیں گے۔ ان کے فکری اور سنجیدہ تجزیوں سے ملک کے صاحبِ نظر لوگ استفادہ کرتے ہیں اور ہمارے ملک کی تہذیبی رفتار میں ان کے خطابات کا گہرا اثر ہے۔ (ان کا یہ عہد آفریں مقالہ چونکہ طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت نومبر شمارہ میں شائع ہو گیا ہے اس لئے میں اس کے مندرجات کی تفصیل میں جانا ضروری نہیں سمجھتا۔)

پرویز صاحب کے اس فکر انگیز اور نظر کشا خطاب کو لوگوں نے نہایت جاذب و انہماک سے سنا اور موجودہ خلفشار کو پرکھنے اور دیکھنے کے لئے ایک نئے زاویۂ نگاہ سے شناسائی ہوئی۔

قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کا اجلاس ـ ۱۲ ½ بجے

قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی ایک ایسی کوشش کا نام ہے جو ملت کے فرزندوں میں سیرتِ فولاد پیدا کرنے

کی متمنی ہے۔ اس کوشش میں ملک کے کونے کونے کے صاحبانِ علم و بصیرت مصروفِ جدوجہد ہیں۔ یہ اجلاس قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے سیکرٹری محترم شیخ سراج الحق صاحب کی صدارت میں شروع ہوا۔ اس اجلاس کی غرض و غایت بتاتے ہوئے محترم ظفر احسن محمود صاحب نے فرمایا کہ احباب قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کی رفتارِ کار سے پوری طرح واقف نہیں ہوئے لہٰذا اب تفصیلی طور پر اس بارے میں گفتگو کی جائے گی۔ اس سلسلے میں مختلف احباب نے اس سوسائٹی کی رفتارِ کار کو تیز تر کرنے کے مفید مشورے دیئے۔ سامعین کو بتایا گیا کہ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے ذمہ دار احباب اپنی ذمہ داریوں سے کماحقہٗ آگاہ ہیں اور پوری دلجمعی سے اس کام کو کر رہے ہیں۔ خارجی موانعات اگرچہ سدِّ راہ بن جاتی ہیں لیکن انشاء اللہ ہم اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ اس کی بھی وضاحت کی گئی کہ ہمارا کالج کوئی کرسچن کالج نہ ہوگا اور نہ ہی ہم کوئی کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ ہمارا نصب العین دوسروں سے بالکل جدا اور منفرد ہے۔ اس کے بعد حسین آرزوں اور مقدس دعاؤں کے ساتھ یہ اجتماع ختم ہوا۔

پرویز صاحب کا الوداعی خطاب

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا!

اراکینِ بزم، اپنے سہ روزہ قیام کے بعد واپس اپنے کاشانوں میں جانے والے کتنے ہنستے ولولے، نیا جوش و خروش اور نئی امنگیں ان کے ساتھ تھیں۔ اس فضا میں محترم پرویز صاحب نے اراکین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ

رفیقانِ محترم! ابھی آپ کے آنے والے قدموں کی نشید جاں فزا میرے کانوں میں گونج رہی ہے کہ مجھے اب آپ کو الوداع کہنا پڑ رہا ہے۔ ویسے تو ہر آنا جانے ہی کے لئے ہوتا ہے لیکن جو جانا پھر آنے کی تمہید بن جائے وہ کچھ ایسا یاس انگیز نہیں ہوتا۔

اس دفعہ آپ کے لئے ایک اہم الوداعی پیغام میرے پیشِ نظر ہے۔ کنونشن کے اجتماعات میں آپ کے کانوں میں یہ آوازیں بار بار آئی رہیں کہ طلوعِ اسلام نے جو کچھ اتنا عرصہ پہلے کہا تھا وہ حرف بحرف پورا ہو رہا ہے اور قوم ہر طرف سے ہانکتی کراسی نصب العین کی طرف آ رہی ہے جسے اس نے بطورِ نشانِ منزل تجویز کیا تھا۔ ہم نے تیس سال پہلے قوم کو متوجہ کیا کہ جماعتِ اسلامی قوم اور اسلام دونوں کے لئے شدید خطرہ کا موجب ہے۔ آج ملک میں چاروں طرف سے یہی آواز سنائی دے رہی ہے۔ اس نے بیس بائیس سال پہلے کہا کہ کتاب و سنت کی بنیادوں پر کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ آج متشدد قدامت پسندوں کی طرف سے بھی

اس حقیقت کا اعتراف ہو رہا ہے۔ اس نے سالہا سال پہلے کہا کہ تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکتِ اسلامی کے سر پر عاید ہوتی ہے اور مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری کو عہدہ برآ ہونے کے لئے وسائلِ مملکت کو اپنی تحویل میں لے سکتی ہے۔ آج سوشلزم کے حامیوں کی طرف سے نہیں بلکہ نظامِ سرمایہ داری کے علمبرداروں سے بھی یہی آواز بلند ہو رہی ہے۔

یہ صورتِ حال یقیناً ایسی ہے جس پر آپ جس قدر بھی اظہارِ مسرت کریں، کم ہے۔ لیکن یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں پہلے سے بھی زیادہ سرگرمی کے ساتھ آمادہ بہ کار ہونا پڑے گا۔ اس سلسلے میں آپ سورۃ النصر کی ان آیات پر غور فرمائیے۔

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ ۙ وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ
اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۙ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَ اسۡتَغۡفِرۡہُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا

یعنی اے رسول! جب خدا کی فتح اور نصرت تیرے ہم آغوش ہو اور تو دیکھے کہ لوگ
کس طرح انبوہ در انبوہ تمہارے نظام میں داخل ہو رہے ہیں۔ تو ۔ ۔ ۔ ۔

ان الفاظ کے سننے کے بعد دنیا یہی کہے گی کہ اس کے بعد کہا گیا ہوگا کہ تم اپنی اس فتح و کامرانی پر جشنِ مسرت مناؤ۔ اور اطمینان کی نیند سو جاؤ کہ تم نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔ لیکن خدا اپنے رسول سے اس کے بعد یہ کہتا ہے کہ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ ۔۔۔ اس کے بعد تو اپنے اس پروگرام کو وجہِ حمد و ستائش بنانے کے لئے اور شدت سے سرگرمِ عمل ہو جا۔ اسی حقیقت کو اس نے ان جامع الفاظ میں دہرایا ہے کہ فَاِذَا فَرَغۡتَ فَانۡصَبۡ ۔ جب تو اپنے پروگرام کی ایک کڑی سے فارغ ہو جائے تو یہ نہ سمجھ کہ اب تمہارا فریضہ ادا ہو گیا بلکہ اس کے بعد اس کی اگلی کڑی کو لے کر اس پر استقامت سے جم جاؤ۔

لہٰذا میرے عزیز رفیقو اور ہمسفرو! آپ کے پروگرام کی موجودہ کامیابی کہیں آپ کو اس فریب میں مبتلا کر کے کہ اب منزل طے ہو گئی ہے، آپ کو محوِ خواب یا سست خرام نہ کر دے۔ کاروانِ قرآنی کا تو پروگرام یہ ہوتا ہے کہ

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

یہاں تو عمر بھر کے لئے چلنا ہے، آخری سانس تک چلنا ۔۔۔ بلکہ اس کے بعد بھی پھر آگے چلنا۔ لہٰذا ہمارے ہاں آرام طلبی کا کوئی مقام ہی نہیں۔ جو لوگ آپ کی پیش کردہ دعوت کے الفاظ دہرا رہے ہیں وہ ابھی حصۂ لا تک پہنچے ہیں، انہیں اِلّا کی منزل تک لانا، ہنوز آپ کے ذمے ہے، لہٰذا آپ پہلے سے بھی زیادہ ہمت اور مستعدی سے اس

پروگرام کی تکمیل کے لئے پابہ منزل رہیئے۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت آپ کے ساتھ ہو!!

والسلام!

پرویزؔ صاحب کے اس پیغامِ حیات آور کو بطور زادِ سفر اپنے ساتھ لیتے ہوئے یہ کاروانِ نور و نکہت اپنے اپنے نشیمن کی طرف فرحاں و خنداں لوٹ گیا ــــــ لوٹ گیا پھر آنے کے لئے ــــــ!

ــــــ (۲) ــــــ

قرار دادیں

(۱) شرکائے کنونیشن بزمہائے طلوعِ اسلام کی طرف سے بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ کہ اس نے سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے کنونیشن کے جملہ انتظامات بحسن و خوبی سرانجام دیئے اور اس کے لئے شب و روز انتھک محنت کی۔ (محرک۔ محمد اسلام)

(۲) بزمِ طلوعِ اسلام لاہور ان تمام شرکائے کنونیشن و مہمانانِ خصوصی کی شکرگذار ہے جنہوں نے سفر کی صعوبتوں اور گوناگوں رکاوٹوں کے باوجود کنونیشن میں شرکت فرما کر اسے کامیاب بنایا۔ (محرک: ایم لطیف چوہدری)

(۳) محترم مرزا محمد خلیل صاحب نے اتنی مدت تک ادارہ طلوعِ اسلام کی نظامت کے فرائض جس پرخلوص طریق سے سرانجام دیئے ہیں یہ کنونیشن اسے بنظرِ استحسان دیکھتی ہے اور ان کی ان خدمات کے لئے دلی شکرگذار ہے۔

(محرک۔ طالب حسین)

(۴) راولپنڈی بزم کے ممتاز رکن ملک ظہور احمد ایک عرصہ دراز سے محترم پرویز صاحب کے درس قرآن کریم کے ٹیپس کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کا فریضہ رضاکارانہ طور پر سرانجام دے رہے ہیں یہ مرحلہ جس قدر ہمت طلب اور صبر آزما ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ جس قدر استقامت، ثبات اور استقلال سے اس کوشش میں والہانہ طور پر مصروف ہیں وہ قابلِ صد رشک اور موجب ہزار فخر و مباہات ہے۔

طلوعِ اسلام کی یہ کنونیشن محترم ظہور صاحب کی خدمت میں دلی ہدیۂ تبریک پیش کرتی ہوئی دست بدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں مزید توفیق عطا فرمائے کہ وہ اس مبارک فریضہ کو تکمیل تک پہنچا دیں۔ یہ کنونیشن بزمِ راولپنڈی کو بھی درخورِ مبارکباد سمجھتی ہے جسے اس قسم کا کوہکن میسر ہے۔ (محرک: طالب حسین)

(۵) بزمِ کراچی تحریک کے فروغ کے لئے جن نئے نئے طرق و اسالیب سے مصروف جد و جہد ہے، طلوعِ اسلام کی یہ کنونیشن اسے نہایت قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور آرزومند ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی ہمتوں

میں برکت، ان کے عزائم میں ثبات اور اُن کے وسائل میں کشاد عطا فرمائے تاکہ وہ اس کی کتابِ عظیم کی خدمت، اس سے بھی زیادہ ذوق وشوق اور جوش و ولولہ سے کر سکیں۔

بزمِ کراچی کی طاہرہ بیٹیوں نے جس ذوق وشوق اور سلیقہ وشائستگی سے اپنی مصنوعات کو کنونشن میں پیش کیا ہے اور جس جذبۂ ایثار سے کام لے کر انہوں نے ان مصنوعات کی قیمت طلوعِ اسلام کالج فنڈ کی نذر کی ہے۔ یہ کنونشن اس کے لئے ان بیٹیوں کو صد ہزار مبارکباد کے قابل سمجھتی ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے معصوم ہاتھوں کے لگائے ہوئے ان ننھے ننھے پودوں کو شجرِ طیب بنا دے۔

(محرک۔ ایم لطیف چوہدری)

(۶) **قرار دادِ تعزیت**

سالِ رواں میں حلقۂ قرآنی کے چار مخلص رفقاء محترم خان عبدالحکیم خان (مردان)، محترم بلند اقبال خان (لاہور)، محترم میاں چراغ حیدر (میانوالی)، محترم ماسٹر غلام محمد انصاری (لائل پور) ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

طلوعِ اسلام کا یہ کنونشن دلی صدمہ کے ساتھ ان احباب کے پسماندگان سے اظہارِ تعزیت کرتی اور اللہ سے دعا کرتی ہے کہ قرآن کے ان شیدائیوں کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔   (محرک: طالب حسین)

———— (۞) ————

طلوعِ اسلام کے آئندہ شمارہ میں

پرویز صاحب کا کنونشن کا خطاب

قدیم اور جدید میں کشمکش

کیا قانونِ شریعت میں تبدیلی ہو سکتی ہے؟

استقبالیہ

جس سے صدر کنونشن کمیٹی، میاں ظفر احسن محمود نے مندوبین کو خوش آمدید کہا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

رفیقانِ ہم سفر۔ سلام و رحمت!

ماہِ اکتوبر کی اس مسکراتی چمکتی اور بہاریں صبح میں میری مسرت اور خوشی کا حساب نہ پوچھیے جو مجھے یہ سعادت نصیب ہو رہی ہے کہ میں مشعل برداران قرآن کی اس عظیم الشان برادری کو خوش آمدید اور مرحبا کہہ سکوں۔ میرے عزیز بھائیو! خدائے کریم آپ کی عمروں میں درازی، آپ کے عزائم میں پختگی، آپ کے قدموں میں ثبات و استقلال اور آپ کے مقاصد میں کامیابی عطا کرے۔ آپ ہزار ہا ہزار سال اس درخشندہ و پائیندہ مقصد کی کرنیں بکھیرتے اسی طرح یہاں آتے رہیں اور قرن تا قرن، قرآنِ خالص کی ضیا بار روشنی سے دنیا و جہان کی راہیں روشن کرتے رہیں۔

آپ کو خوش آمدید کہتے کہتے میری زبان نہیں تھکتی اور آپ کو مرحبا مرحبا کہتے کہتے میرا جی نہیں بھرتا۔ یقین کیجئے آپ کے قدموں میں آنکھیں بچھاتے بچھاتے ہم بزمِ لاہور والے کبھی کماحقہٗ سیر نہیں ہو پاتے۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آپ کی آمد ہمارے سُناں خانہ ہائے دل کی آبادی ہے۔ آپ کا اجتماع ہمارے لئے وجہ تقویت ایمان اور باعثِ تجدیدِ عزائم بنتا ہے۔ آپ کے ہم دوش کھڑے ہو کر ہمیں موقع فراہم ہوتا ہے کہ سالِ گزشتہ کے بارہ میں احتسابِ خویش کر سکیں اور سالِ آئندہ کے لائحہ عمل کو ترتیب دے سکیں۔ آپ کے قرب و حضور میں یہ سرور آگیں احساس جاگتا ہے کہ قافلۂ دینِ قیّم میں اب کوئی مسافر یکہ و تنہا نہیں۔ اور اب تاریکی و ظلمات کی وادیوں میں کسی سرفروش کو اکیلا پن نہیں ڈستا۔ ہم آپ کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے انتہائے اعتماد و استقلال کے ساتھ زمانے کی ویران راہوں کے اندھیرے پاٹنے کے لئے رواں دواں ہیں۔ آپ کی رفاقت میں ہم اس یقین محکم سے سرشار ہوتے ہیں کہ ہر

جانے والی شام مقصدِ حیات کا سویرا نزدیک تر لا رہی ہے اور ہر لحہ و ہر گام انقلابِ قرآنی قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ احساس یہ اعتماد اور یہ بھروسہ ایک عظیم سرمایۂ عظیم اور متاعِ کثیر ہے۔

صاحبانِ محترم! سال گذشتہ عجب افراتفری اور انتشار میں گزرا ہے۔ ہر طرف عدم اعتماد، ابہام اور تشکک کا دور دورہ رہا۔ عجیب و غریب نظریات سامنے آئے اور تعجب انگیز نعرے بلند ہوتے۔ الفاظ بے معنی اور افکار لایعنی کے انبار لگ گئے۔ جو کہا گیا وہ کسی کے بھی دل کی بات نہ تھی اور وہ جو ہر ایک کے دل میں تھی مُدتے کہا ہی نہیں گیا۔ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی اور ہر حیلہ جو اور موقع پرست راہِ حق کا مجاہد و غازی بن بیٹھا۔ خود غرض اور کوتاہ اندیش رہنماؤں نے موقع پرستی، مطلب براری، بدنظمی، طوائف الملوکی کا وہ غبار اٹھایا کہ کچھ وقت کے لئے تو وطنِ عزیز کی نظریاتی بنیادیں بھی دھندلا گئیں۔

یہ غبارِ خاک ابھی تک فلک گیر اور زمیں پوش ہے۔ الحمدللہ۔ باری تعالےٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اور نہایت یقین و اعتماد سے کہا جا سکتا ہے کہ ایک اور صرف ایک طائفہ کم مایگاں ایسا بھی نکلا ہے جو نورِ قرآنی سے فروزاں مشعلیں ہاتھوں میں لئے، اپنے دیدہ ور دور اندیش رہبر اور قرآن فہم راہنما کی قیادت میں نہایت استقلال و صبر سے جاری۔ نہایت خاموشی اور متانت کے ساتھ اپنے منتہائے مقصود کی جانب رواں دواں رہا۔ وادئ پُرخار میں ہر جھاڑ و جھنکار سے دامن بچاتا ایک قافلۂ آبلہ پایاں ایسا تھا جو اپنی منزل کی طرف آہستہ آہستہ فرحاں و خنداں چلتا رہا۔ اگرچہ ان کا جلوہ خیرہ کن نہ تھا اگرچہ ان کی رفتار برق وش نہ تھی مگر ان کے قدموں کا ثبات اور ان کے دلوں کا استغنا ہر لحہ و آں وقت کے ناپیدا کنار ریتے پر اپنے چمکدار نقوش بنا تا گیا ہے اور بنا رہا ہے۔

میرے دوستو! یہ مبارک قافلہ صرف آپ ہی کی جماعت ہے اور یہ راہبر بالبصر صرف پرویز صاحب کی ذاتِ ستودہ صفات ہے۔ زندہ و جاوید نظریہ اور ثبات آشنا پیغام صرف پیامِ قرآنی ہے اور اس آوازۂ حق کا علمبردار طلوعِ اسلام ہے۔ خود دیکھ لیجئے کہ آج جب ہنگامہ خیزیوں کا گرد و غبار کچھ کم ہو رہا ہے تو نظر آتا ہے کہ وہ برق رفتار جو ستاروں سے خبر لے آنے کے مدعی تھے۔ تھکان اور درماندگی سے چور چور ہیں لیکن آپ کے قدموں کی صدائے بازگشت آج بھی ہر کوچہ و بام سے آ رہی ہے۔

کل جب فتنہ و فساد نقطۂ عروج پر تھا اور آج جب شعور و غوغا اپنی انتہا پر ہے صرف آپ ہی کا موقف ہے جو مثبت اور قائم بذات کہلا سکتا ہے اور صرف آپ کا مسلک ہے جو جنت بداماں قائم رہ سکتا ہے۔ اور مجھے تو سب ہے وثوق کی کہ آنے والے کل کو جب اس شعور و شر کے بعد ایک بھیانک خاموشی اور مرگھٹ کا سکوت اس ملک کے ہنگامہ خیزوں کا مقسوم بن جائے گا صرف آپ ہی کا پھریرا وہ علمِ ربانی ہو گا جو ہر طرف رنگ و نور

اور آس و امید کی برکتیں بکھیرے گا۔

خدائے عزّوجل کا احسان ہمارے بابا جی پر ہے اور ان کا احسان ہم پر ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر اور ایک مسافت کے ہر مرحلے پر ترک کر ہم نے خدائے حکیم کی کتاب مبین سے راہنمائی حاصل کی۔ مقامِ شکر ہے کہ اللہ نے ہمیں اس لائق بنایا اور اس میں مداومت بخشی کہ ہم تمام مسائل کا حل اس ازلی ابدی، ہمہ وقت محفوظ اور لازوال خزینے سے حاصل کرلیں جسے نورِ مبین اور سراجاً منیرا کہا گیا ہے اور تمام معاملات میں حکم و سند اسی کو اور صرف اسی کو قرار دیں۔

میرے عزیز ہم جلیسو! آج کا دن ہمارے لئے یومِ فتح ہے۔ یہ صرف طلوعِ اسلام کا آوازۂ داعیٔ حق ہے جو پاکستان کے ہر کہہ و مہ کی زبان پر ایک حقیقتِ مسلمہ اور ایک یقینی مطالبہ بن کر مسلط ہو گیا ہے۔ یہی وہ سچا اور پاک راستہ ہے جس کے سامنے دوسرے تمام نظریات و عقاید آج باطل و ہیچ نظر آ رہے ہیں۔ الحمد للہ کہ انسانوں کے تراشیدہ لات و منات آج خدائے محمدؐ کے حضور سرنگوں اور سجدہ ریز نظر آتے ہیں۔ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے اور حقیقت وہ جو خود کو بزورِ اندرون منوالے۔

مجھے یقینِ کامل ہے کہ وہ وقت دور نہیں اور چشمِ تصور میں وہ عہد دیکھ رہا ہوں جب تمام جماعتیں اور گروہ آوازۂ قرآن اور طلوعِ اسلام کے مسلک کو من و عن اپنا لیں گے۔ اور پھر ہاتفِ غیب پکارے گا۔ اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَ اسۡتَغۡفِرۡہُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا۔

اے برادرانِ عزیز! آپ آگئے ہمارے لئے مژدۂ عید ہوا۔ ہمارے قلب و جگر روشن ہوئے۔ ہماری آنکھیں ٹھنڈی اور ہمارے دل مسرور ہوئے۔ اس آمد کے لئے آپ کا ہزار بار شکریہ۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہم ایک ہی شاخ کے پھول ہیں۔ ہمارے جسم الگ الگ ہیں مگر دلوں کی دھڑکن ایک ہے۔ ہمارا مقصدِ حیات ایک ہے اور ہماری منزل واحد ہے تو پھر کون مہمان ہوا اور کون میزبان۔ آپ یہاں اجنبی نہیں یگانے ہیں۔ ہم لاہور والوں نے اپنی ہر ممکن کوشش کی ہے کہ آپ کا قیام لاہور بہ سکون و آرام گزرے۔ لیکن بہرصورت ہمیں اپنی بے مائیگی اور کوتاہ دامنی کے اعتراف میں بھی کوئی تامل نہیں۔ ہو سکتا ہے ان تمام مساعی کے باوجود ہم آپ کی شایانِ شان مدارت نہ کر سکے ہوں تو اس کیلئے ہم تہ دل سے معذرت خواہ ہیں۔ اگر آپ میں سے کسی صاحب کو کوئی زحمت یا تکلیف درپیش ہو تو براہِ کرم اپنی بات برادرِ محترم محمد نصر اللہ خاں صاحب تک ضرور پہنچا دیجئے جو کیمپ کمانڈر ہیں یا پھر برادر محترم چوہدری ایم لطیف صاحب کی طرف رجوع فرمایئے جو نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور ہیں۔ انشاء اللہ آپ ہمیں خدمت پر مستعد پائیں گے۔

اب میں اپنے استقبالیہ کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ اے خدا ہمارے دلوں میں زیادہ سے زیادہ محبت اور یکجہتی پیدا کر۔ ہمیں ہم نگہی اور ہم آہنگی عطا فرما۔ الٰہی ہمیں ان لوگوں میں سے نہ کرنا جن کے اجسام تو مجتمع ہو جاتے ہیں مگر دلوں پر تشتت اور انتشار کی حکمرانی ہوتی ہے۔ الٰہی ہمیں صراطِ مستقیم پر چلنے اور جادۂ قرآنی پر صبر و ثبات سے کھڑے ہونے کی استقامت عطا فرما۔ الٰہی ہمارے راہبرِ مشفق کو عمرِ خضر اور صحتِ کاملہ عنایت کر تاکہ وہ تیرے دین کا غلغلہ مشارق و مغارب سے بلند کر سکیں اور اس طرح یہ کرۂ ارض اپنے پیدا کرنے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ آمین! شکریہ!

طلوع اسلام کنونشن

طلوعِ اسلام کالج

اپنے انداز کی منفرد درسگاہ

رپورٹ: پیش کردہ محترم شیخ سراج الحق صاحب سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

خواتین و حضرات!

قوموں کا مستقبل ان کی ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جس قسم کے آج کے نوجوان اسی قسم کی کل کی قوم۔ اگر نوجوانوں کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہو جائے۔ تو قوم خود بخود صحیح قالب میں ڈھل جائے گی۔ حصولِ پاکستان کے بعد سب سے مقدم کرنے کا کام یہ تھا۔ کہ ہم اپنے بچوں کی تعلیم اس آئیڈیالوجی کے مطابق کرتے جس کے تحفظ کے لئے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔ ہم نے اس مقدس فریضہ سے مجرمانہ تغافل برتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ ہم آج اپنی قوم کی بے راہ روی کا ماتم کر رہے ہیں۔ یہ قوم کون سی ہے، جس کی ہم اس قدر شکایت کرتے ہیں؟ یہ انہی نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ جو تشکیلِ پاکستان کے وقت ہماری درس گاہوں میں زیرِ تعلیم تھے۔ وہی طالب علم بیس بائیس برس کے بعد اب ہماری قوم کا ہوشمند طبقہ بن گئے ہیں۔ اور انہی کا رونا ہم آئے دن روتے رہتے ہیں۔ لیکن ہماری حالت بھی عجیب ہے۔ ہم قوم کی بے راہ روی کا رونا بھی روتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ہر سال اسی قوم میں اضافہ بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ جو نوجوان ہماری درس گاہوں سے غلط تعلیم حاصل کر کے باہر نکلتے ہیں۔ وہ ہماری قوم کے اجزا بنتے ہیں۔ اس تباہی سے بچنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں۔ کہ ہم قوم کے نوجوانوں کی تعلیم کا صحیح انتظام کریں۔

۲۔ پاکستان کی آئیڈیالوجی۔ قرآن کریم کی تعلیم اور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے سوا اور کیا ہے۔ لہٰذا ہمارے نوجوانوں کی صحیح تعلیم کا مقصود بھی اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ ان کے قلب و دماغ کو اسی سانچے میں ڈھالا جائے۔ اور ان میں ایسی صلاحیت پیدا کر دی جائے۔ کہ دنیا کا کوئی معاملہ سامنے آئے۔ وہ فیصلہ

کر سکیں کہ اس باب میں قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ اس کا طریق یہ نہیں۔ کہ دینی تعلیم کے لئے مکتب و دارالعلوم الگ کھولے جائیں۔ اور دنیاوی تعلیم کے لئے اسکول اور کالج الگ۔ دین اور دنیا کی یہ ثنویت یکسر اسلام کے خلاف ہے۔ نہ ہی اس کا یہ طریق ہے کہ سکولوں اور کالجوں میں ایک پیریڈ (PERIOD) دینیات کا رکھ دیا جائے۔ یا ایم۔ اے کے لئے اسلامیات کا الگ مضمون تجویز کر لیا جائے۔ ان طریقوں سے طالب علموں کی معلومات میں تو کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ان سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ جسے علامہ اقبالؒ نے نہایت جامع انداز میں یوں بیان کیا ہے۔ ؎

از کلید دیں درِ دنیا کشاد

اسلامی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اسے حاصل کرنے کے بعد طالب علم اس قابل ہو جاتے کہ "دنیا کا ہر دروازہ دین کی چابی سے کھول سکے۔" اس مقصد کے لئے تعلیم کا صحیح طریقہ یہ ہے۔ کہ طالب علم طبیعیات پڑھیں یا عمرانیات۔ تاریخ پڑھیں یا فلسفہ۔ وہ معاشیات کا مطالعہ کریں یا سیاسیات کا۔ غرضیکہ وہ علم کے کسی شعبے سے متعلق کیوں نہ ہوں، انہیں یہ بتایا جائے کہ علم کا یہ شعبہ اس پروگرام کی تکمیل کے لئے کس طرح ممد و معاون ہو سکتا ہے، جسے قرآن نے انسانی زندگی کا مقصود و منتہا قرار دیا ہے۔ یہ پروگرام اس کے سوا کیا ہے۔ کہ

"فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں وحیٔ خداوندی کی روشنی میں نوعِ انسان کی منفعت عامہ کے لئے صرف کیا جائے۔"

اسے بالفاظِ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے۔ کہ قوم کے نوجوان طالب علموں کے دل و دماغ میں اس حقیقت کو راسخ کر دیا جائے کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو وحی کی متعین کردہ مستقل اقدار کے تابع رکھنا ہی شرفِ انسانیت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس سے ان کی سیرت میں وہ پختگی اور کردار میں وہ پاکیزگی پیدا ہو جائے گی۔ جس کے فقدان کا ہم اس وقت اس قدر رونا روتے ہیں۔

(۳) تعلیم کے جس نظریہ کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے سب سے بڑے نقیب، مفکرِ قرآن، محترم پرویز صاحب ہیں جنہوں نے اپنی زندگی، فکرِ قرآنی کی نشر و اشاعت کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان میں والہانہ انداز سے حصہ لیا۔ تو اسی مقصد کے پیشِ نظر کہ جب تک اپنی آزاد مملکت نہ ہو، اسلام ایک زندہ حقیقت نہیں بن سکتا۔ اب تشکیلِ پاکستان کے بعد وہ اس نظریئے کے عام کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔ کہ یہ مملکت اسلامی قالب میں ڈھل نہیں سکتی۔ جب تک قوم کے بچوں کی تعلیم و تربیت قرآنی خطوط پر نہ ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے آج سے کچھ عرصہ پہلے یہ تجویز پیش کی۔ کہ ایک اپنا کالج کھولا جائے۔ جس میں عام تعلیم یونیورسٹی کے منظور شدہ قاعدہ کے مطابق ہو۔ تاکہ وہاں کا فارغ التحصیل

طالب علم، زندگی کے کسی شعبے میں، دوسرے کالجوں کے طالب علموں سے پیچھے نہ رہ جائے۔ اور اس کے لئے مختلف میدان، دوسرے طالب علموں کی طرح کھلے ہوں۔ لیکن اس کالج میں یہ مضامین اس طرح پڑھائے جائیں کہ طلبا کو ساتھ کے ساتھ معلوم ہوتا جائے کہ ان میں کون سی بات قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ اور قرآن کریم اس باب میں کیا نقطۂ نگاہ پیش کرتا ہے۔ علاوہ ازیں انہیں قرآن کریم کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ:۔

(۱) ۔۔ پاکستان میں وقتاً فوقتاً جو مسائل سامنے آئیں۔ وہ بتا سکیں کہ اس باب میں قرآن کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ اسلامی مملکت کا آئین کیسا ہونا چاہیئے اور قوانین کس قسم کے۔ افراد کی زندگی، اسلامی قالب میں کس طرح ڈھل سکتی ہے اور معاشرہ قرآنی خطوط پر کس طرح متشکل ہو سکتا ہے۔ وہ کون سی عملی کسوٹی ہے جس سے ہر وقت معلوم کیا جا سکتا ہے کہ قوم صحیح راستے پر چل رہی ہے۔ یا اس کا کوئی قدم غلط سمت کو اٹھ گیا ہے۔ اور

(۲) ۔۔ دنیا کی مختلف قومیں اس وقت جن معاشی، معاشرتی، سیاسی، قومی اور بین الاقوامی مسائل سے دوچار ہیں اور جن کا کوئی اطمینان بخش حل انہیں نہیں ملتا۔ جس کی وجہ سے امن عالم سخت خطرے میں پڑ رہا ہے۔ قرآن کریم ان مسائل کا حل کیا تجویز کرتا ہے۔

اس کالج کے فارغ التحصیل طالب علم ایسی قابلیت کے مالک ہوں کہ وہ دنیا کے بڑے بڑے اجتماعات میں قرآنی نقطۂ نظر نہایت وضاحت سے پیش کر سکیں اور خود اپنے ملک میں بھی اپنوں کی فکری راہنمائی کر سکیں۔

ذہنی قابلیت کے علاوہ ان کا کیریکٹر بھی اتنا بلند ہونا چاہیئے کہ وہ دوسرے نوجوانوں کے لئے قابلِ تقلید مثال بن سکیں اور اسی طرح اس حقیقت کی زندہ شہادت پیش کر سکیں۔ کہ جب انسانی قلب و دماغ قرآن کے قالب میں ڈھل جائیں۔ اور وہ سیرتِ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے سامنے بطور اسوۂ حسنہ کے رکھ لیں۔ تو اس سے کس طرح ایسے انسان پیدا ہوتے ہیں۔ جن پر انسانیت فخر کر سکے' ظاہر ہے کہ اس قسم کی تربیت کے لئے کالج کے ساتھ ہوسٹل کا ہونا بھی ضروری ہے۔

یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے ایک جدید طرز کی درس گاہ کے قیام کا پروگرام سامنے رکھا گیا۔ تجویز یہ تھی کہ اس کی ابتدا ایف اے (سال اول) سے کی جائے اور اسے سال بہ سال آگے بڑھاتے چلے جائیں' اس کے بعد، ابتدائی اسکولوں کی بنیاد رکھی جائے تاکہ شروع ہی سے بچوں کی تعلیم اسی نہج پر ہو۔ درس گاہیں لڑکوں اور لڑکیوں، دونوں کے لئے قائم کی جائیں۔ اور جب یہ سلسلہ پھیل جائے۔ تو اس کے لئے ایک الگ یونیورسٹی قائم کی جائے۔ انہی درس گاہوں میں اساتذہ تیار کئے جائیں۔ اس طرح یہ درس گاہیں ملک کے عام نظامِ تعلیم کے لئے نمونہ کا کام دے سکیں گی۔ اور پاکستان میں ایک نئی قوم تیار ہو جائے گی جو اس

آئیڈیالوجی کی پیکر ہو گی جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔

(۴) پچھلے سال کنونشن میں آپ کے گوش گزار کیا گیا تھا کہ اس مقصد کے لئے "قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی" کے نام سے ایک سوسائٹی متشکل کی گئی۔ جسے حکومت کے ہاں سے باقاعدہ رجسٹرڈ کرا لیا گیا۔ اس کی ایک ایگزیکٹو کمیٹی بھی مقرر کر لی گئی۔ سوسائٹی کے چیئرمین خود پرویز صاحب ہیں۔ جن کی قرآنی فکر کی روشنی میں اس کالج کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔ ان کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں قوم کے بچوں کو ایک گوشہ میں لے کر بیٹھ جائیں۔ اور قرآنی شمع ان کے ہاتھ میں دے کر دنیا سے رخصت ہوں ان کی اس آرزو کی برومندی بھی اسی اسکیم سے وابستہ ہے۔

(۵) — کالج کی تعمیر کے لئے سب سے پہلا مرحلہ زمین حاصل کرنا تھا۔ زمین حاصل کرنے کے لئے جس قدر ابتدائی سرمایہ کی ضرورت تھی۔ اس کے حصول کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اس لئے کوشش کی گئی۔ کہ اراضی کہیں سے بطور عطیہ مل جائے۔ لیکن اس میں ہمیں کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر بعض مخلص احباب کی طرف سے ایک ایسی اسکیم سامنے لائی گئی۔ جس سے (بحمد اللہ) یہ مرحلہ باسانی طے ہو گیا۔ مختلف احباب نے ایک ایک کنال قطعہ اراضی کے لئے عطیات کی پیش کش کر دی ہے۔ جس سے کافی رقبہ حاصل ہو جائے گا۔ پچھلے سال تعمیر فنڈ کے لئے عطیات فراہم کرنے کی مہم بھی شروع کر دی گئی تھی۔ جس کا نتیجہ بہت حوصلہ افزا ہے۔ آپ یہ معلوم کر کے خوش ہوں گے کہ کالج فنڈ میں اب تک قریب ۲،۸۰،۰۰۰ روپے جمع ہو چکے ہیں۔

(۶) — یہ ہیں وہ عزائم جنہیں لے کر قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی وجود میں آئی ہے، ہمیں اس کا احساس ہے کہ یہ اسکیم اپنی تکمیل کے لئے بہت بڑے ذرائع اور وسائل چاہتی ہے۔ جو اس وقت اسے میسر نہیں۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ قوم کے وہ دردمند احباب جو ملت کے سچے بہی خواہ ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ہماری آنے والی نسلیں تباہی سے بچ جائیں۔ اور ان کا وجود باعث فخر پاکستان اور وجہ شرف انسانیت ہو۔ وہ ہمارے اس عزم کو بروئے کار لانے کے لئے آگے بڑھیں گے۔ اور ہر طرح سے ہم سے تعاون کریں گے ہماری آپ حضرات سے گزارش ہے۔ کہ آپ براہ کرم زیادہ سے زیادہ مالی امداد سے اس اسکیم کو کامیاب بنائیں۔ میں توقع رکھتا ہوں۔ کہ اس اجتماع میں صاحب ثروت اور ہمت حضرات اس کارِ خیر کے لئے اپنے عطیات کا اعلان فرمائیں گے۔

والسلام!

سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

پرویز صاحب کی پریس کانفرنس

طلوع اسلام کنونشن سے دو روز قبل (۲۱۔ اکتوبر کی شام) محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کے مکان پر، پرویز صاحب نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا جس میں پریس کے نمائندگان بڑی کثرت سے شریک تھے۔ یہ کانفرنس متانت، سنجیدگی اور مفکرانہ انداز کی نہایت عمدہ مثال پیش کر رہی تھی۔ سوالات بھی متین اور سنجیدہ تھے اور ان کے جواب بھی نہایت پروقار اور فکر انگیز۔ کانفرنس میں جو پریس ریلیز نمائندگان کو دیا گیا تھا۔ اس کا متن حسب ذیل ہے:۔

پریس ریلیز

اس وقت سارا ملک الیکشن کے ہنگاموں میں دیوانہ وار مصروف تگ و تاز ہے۔ اور ہر سیاسی پارٹی کی کوشش یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ نشستیں حاصل کر کے، مملکت کی زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے۔ تحریک طلوع اسلام چونکہ عملی سیاست میں حصہ ہی نہیں لیتی۔ اس لئے مجھے ان سرگرمیوں سے چنداں دلچسپی نہیں لیکن مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہی نہیں، صدمہ ہوتا ہے کہ ہر پارٹی حصول اقتدار کے لئے تو اس قدر مضطرب و بے قرار ہے، لیکن جن بنیادوں پر اس مملکت کی عمارت استوار ہوئی ہے۔ ان کے متعلق کسی کو اتنا دیکھنے کی بھی فرصت یا ضرورت نہیں کہ وہ اپنے مقام پر قائم بھی ہیں یا نہیں۔ اس مملکت کی عمارت دو بنیادوں پر استوار ہوئی تھی۔

(۱) دو قومی نظریہ — یعنی یہ حقیقت کہ اسلام کی رو سے معیارِ قومیت، دین کا اشتراک ہے۔ نہ کہ اشتراکِ وطن۔ اس نظریہ کا عملی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ملک میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم مل کر ایک قوم کے افراد نہیں بنتے — مسلمان غیر مسلموں سے الگ مستقل قوم کی حیثیت رکھتے ہیں — یہی نظریہ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد تھا۔

(۲) اسلام ایک زندہ حقیقت اس صورت میں بن سکتا ہے۔ کہ مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں اسلامی نظام قائم اور قوانین شریعت رائج کئے جا سکیں۔

(۲) — جہاں تک پہلی بنیاد (دو قومی نظریہ) کا تعلق ہے۔ پاکستان میں اُسے آج تک عمل میں لایا ہی نہیں گیا۔ اور اب بھی کسی پارٹی کے منشور میں اس کا ذکر تک نہیں — حتّیٰ کہ جماعتِ اسلامی کے منشور میں بھی نہیں۔ جن کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان میں اس نظریہ کا تصور ہی انہوں نے دیا تھا۔

(۳) — جہاں تک دوسری بنیاد (اسلامی قوانین شریعت) کا تعلق ہے، اس کے لئے مطالبہ یہ پیش کیا گیا۔ کہ دستورِ پاکستان میں یہ شق رکھ دی جائے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون رائج نہیں ہوگا۔ جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ یہ مطالبہ (نظر بظاہر) بڑا معقول اور مقدس تھا لیکن میں نے شروع ہی سے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ اس اصول کی رو سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا۔ جسے مسلمانوں کے تمام فرقے یکساں طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ لہٰذا! جو نظریہ ناممکن العمل ہو اسے پیش کرنے یا منوانے سے حاصل کیا — ؟ اس مخالفت کی پاداش میں مجھے جن نامساعد حالات سے گزرنا پڑا۔ اُس سے کون ناواقف ہے — ! لیکن میں نے انہیں انتہائی صبر و سکون سے برداشت کیا اور اپنے مُوقف کو برابر دہرائے چلا گیا — تئیس سال کی کشمکش کے بعد بالآخر مخالفین کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ میرا مُوقف مبنی بر حقیقت تھا۔ چنانچہ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے حال ہی میں اس امر کا اعلان کیا ہے کہ

کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ۔ جس پر
مسلمانوں کے تمام فرقے متفق ہو سکیں —

اس کا علاج انہوں نے یہ بتایا ہے کہ ملک میں فقہ حنفی کو مملکت کے قانون کی حیثیت سے نافذ کر دیا جائے۔ اس کی تائید میں انہوں نے یہ نہیں کہا کہ چونکہ فقہ حنفی کتاب و سنت کی بہترین تعبیر ہے۔ اس لئے اسے ملک کا قانون قرار دے دیا جائے — انہوں نے مغرب کے اصولِ جمہوریت کے مطابق کہا یہ ہے کہ فقہ حنفی کو اس لئے نافذ کر دیا جائے کہ ملک کی آبادی کی اکثریت اس فقہ کی پابند ہے۔ اس کے خلاف اقلیت (یعنی غیر حنفی فرقوں) نے سخت احتجاج کیا ہے حتّٰی کہ شیعہ حضرات نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "اگر اس پر اصرار کیا گیا تو ہم اس ملک اور اپنے مستقبل کے بارے میں نئے انداز سے سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ خواہ ایک ناگوار فرض کی حیثیت سے سہی "

"کتاب و سنت" کی رو سے ضابطہ قوانین کی تدوین کی عملی حیثیت تو یہ ہے لیکن ملک کی کم و بیش ہر پارٹی نے بلا سوچے سمجھے، اسے اپنے منشور میں شامل کر رکھا ہے — بلا سوچے سمجھے کی ایک بین مثال پیپلز پارٹی کا مُوقف ہے — وہ ملک میں سوشلسٹ نظامِ معیشت رائج کرنا چاہتے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا — ایسا کہتے وقت وہ اتنا نہیں سوچتے کہ جب انہوں نے کتاب کے ساتھ 'سنت' (روایات) کو بھی اپنے نظام کی بنیاد تسلیم کر لیا۔ تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ — نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ انہیں جتنی روایات نظامِ سرمایہ داری کے خلاف ملیں گی، ان سے کہیں زیادہ روایات ان کے مخالفین کی طرف سے نظامِ

سرمایہ داری کے حق میں پیش کر دی جائیں گی۔ اس صورت میں وہ یہاں کونسا نظام نافذ کر سکیں گے۔ (اس قسم کے تضادات بر پارٹی کے سامنے آئیں گے) کیونکہ جو کچھ انہوں نے اپنے منشور میں دیا ہے۔ متعدد روایات اس کے خلاف جائیں گی۔

بہرحال آپ سوچئے کہ جو مسلک اس وقت اختیار کیا جا رہا ہے، اس کا عملی نتیجہ کیا ہو گا ــــ یہ کہ:۔

(۱) ــــ کتاب و سنت کی بنیادوں پر کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقے متفق طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔

(۲) ــــ اگر مودودی صاحب کی تجویز کے مطابق ملک میں فقہ حنفی کو پبلک لاء کی حیثیت سے نافذ کر دیا گیا تو مذہبی فرقوں میں باہمی فساد شروع ہو جائے گا۔

(۳) ــــ اس فساد کو روکنے کے لئے اگر یہ کہا گیا کہ اندریں حالات، ملک میں سیکولر نظام رائج کر دیا جائے تو مذہب پرست طبقہ اس کے خلاف اعلانِ جہاد کر دے گا۔

یہ ہے وہ صورت حالات، جس کا اس ملک میں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ لیکن ملک ہے کہ انتخابی سرگرمیوں میں دیوانہ وار الجھا ہوا ہے اور کوئی ایک "رجل رشید" بھی ایسا نظر نہیں آتا جو ان سے کہے کہ ذرا کھڑے ہو کر سوچو تو سہی کہ تمہاری ان سرگرمیوں کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

(۴) میں نے شروع ہی میں یہ کہا تھا۔ کہ قرآن مجید وہ کتاب ہے۔ جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہے اس لئے اگر مختلف فرقے اس بات پر رضامند ہو جائیں کہ اپنی اپنی روایات اور فقہ کو الگ کر کے، عصر حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر قرآن مجید کی بنیادوں پر ایک فقہ جدید مرتب کی جائے تو وہ فقہ اس مملکت کا اسلامی ضابطہ قوانین قرار پا سکتی ہے۔ اس کے سوا یہاں اسلامی نظام رائج کرنے کی کوئی شکل نہیں۔ اس تجویز کے سلسلہ میں اکثر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ خود قرآن مجید کی تعبیر بھی تو مختلف فرقوں کے نزدیک مختلف ہے، اس لئے اس کی بنیادوں پر ایک متفق علیہ فقہ کیسے مرتب ہو سکے گی؟ ــــ ایسا کہنے والے غالباً اس حقیقت سے واقف نہیں کہ قرآن مجید کی مختلف تعبیریں اس لئے ہیں کہ ہر فرقہ نے اپنے اپنے ہاں کی روایات اور فقہ کی رو سے اس کی تعبیریں کر رکھی ہیں۔ اگر مختلف فرقے اپنے اپنے ہاں کی روایات، اور فقہ کو الگ رکھ کر قرآنِ خالص کو بنیاد تسلیم کر لیں۔ اور صرف اس کی رو سے ایک جدید فقہ مرتب کرنے پر رضامند ہو جائیں۔ تو پھر قرآن کی مختلف تعبیریں باقی نہیں رہیں گی۔

(۵) ــــ اور اگر یہ کہا جائے کہ مختلف فرقے اس پر بھی رضامند نہیں ہوں گے تو پھر، جرأت کر کے اس تلخ حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ فرقوں کی موجودگی میں اسلامی نظام قائم ہو ہی نہیں سکتا۔ لیجئے آپ

کو خواہ مخواہ فریب میں رکھنے سے حاصل کیا ہے۔! اور اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا۔ کہ جب یہاں نہ دو قومی نظریہ کو اپنایا جا سکتا ہے۔ اور نہ ہی مملکت میں اسلامی نظام کو قائم کیا جا سکتا۔ تو پھر اسلام کی بنیادوں پر پاکستان کے ایک جداگانہ مملکت رہنے کی وجہ جواز ہی باقی نہیں رہتی۔

(۶)۔ یہ ہیں وہ حقائق جن کا ہمیں سامنا کرنا ہوگا۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو پھر نہ الیکشن، ملک کے حالات میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی حکومت خواہ وہ کسی پارٹی کی بھی ہو، ہماری بگڑی کو بنا سکتی ہے۔ ان حقائق سے چشم پوشی ہمیں موجودہ خلفشار تک لے آئی ہے۔ اور اگر ہم ان سے اسی طرح اغماض برتتے رہے تو نظر آتا ہے کہ یہ ہمیں تباہی و بربادی کے عمیق غاروں میں دھکیل دے گی۔ خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے۔

(۷) ۔ طلوعِ اسلام نے تحریکِ پاکستان کا امکان بھر ساتھ دیا تھا۔ تو اس لئے کہ مملکت کی یہ بنیادیں اس کا جزو ایمان تھیں۔ اور تشکیل پاکستان کے بعد بھی وہ اپنے اس مؤقف کو برابر پیش کئے چلے آ رہا ہے۔ تو وہ بھی اس لئے کہ پاکستان کے استحکام اور اس میں اسلام کے احیا کا راز اسی میں مضمر ہے۔ میں نے یہاں ان امور کا ذکر مختصر الفاظ میں کیا ہے۔ ان کی تفصیل، میں اپنے اُن مقالات میں پیش کروں گا، جن سے میں طلوعِ اسلام کی حالیہ کنونشن سے خطاب کرتا ہوں۔ ۲۳۔ اکتوبر (۲½ بجے دوپہر) کے کھلے اجلاس میں میرے خطاب کا عنوان ہوگا

قدیم و جدید کی کشمکش ۔۔۔ کیا قانونِ شریعت میں تبدیلی ہو سکتی ہے؟

اور ۲۵۔ اکتوبر (صبح ۹½ بجے) کے خطاب کا عنوان

قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں۔

اس میں پاکستان کی موجودہ عوامی تحریکوں کا نہایت متانت اور سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے گا۔

والسلام!

اس پریس کانفرنس کی روئیداد مختلف اخبارات میں شائع ہوئی۔ جو فی الجملہ اس تقریب کی صحیح ترجمانی کرتی تھی۔ لیکن "اسلام پسندوں" کے ترجمان ۔۔۔ روزنامہ ندائے ملت میں یہ رپورٹ حسب ذیل الفاظ میں شائع ہوئی۔

لاہور (۲۱۔ اکتوبر۔ نامہ نگار خصوصی) پرویزی مکتب فکر کے سربراہ مسٹر غلام احمد پرویز نے کہا ہے کہ ملک میں اسلامی آئین مرتب کرنے کے لئے سنت کو ترک کر دیا جائے۔ اور تمام ائمہ مجتہدین، فقہاء اور اسلامی قانون کے ماہرین کی تحقیقات کو بھی نظر انداز کر دیا جائے۔ ایک پریس کانفرنس میں انہوں نے کہا کہ تمام فرقوں کے نظریات کو چھوڑ کر صرف قرآن کی بنیاد پر نئے تقاضوں کے مطابق نئی فقہ

تیار کی جائے۔ مسٹر پرویز نے دعوےٰ کیا کہ ان کی تیار کی ہوئی فقہ اس معیار کے مطابق ہے اور وقتی طور پر کام دے سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ علماء نے اپنے ۲۲ نکات میں کہا تھا۔ کہ آئین قرآن وسنت کی بنیاد پر مرتب کیا جائے۔ لیکن یہ ناممکن ہے۔ (ندائے ملت - ۲۲- اکتوبر ۱۹۷۰ء)

اس رپورٹ کے سامنے آنے پر مدیر ندائے ملت کی خدمت میں گذارش کیا گیا کہ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے خلافِ واقعہ ہے۔ اور یکسر کذب وافترا۔ آپ اس کی تردید کیجئے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ اس کی تردید اور تصحیح کر دی جائیگی — لیکن یہ تردید یا تصحیح اس وقت تک ہماری نظروں سے نہیں گزری۔

یہ ہے ہمارے "اسلام پسندوں" کا اندازِ صحافت و دیانت!

مرنے کے بعد کیا ہوگا

ہر شخص اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے

لیکن — اسے جواب کہیں سے نہیں ملتا۔

اس کا جواب ملے گا — ایک تازہ تصنیف

جہانِ فردا

سے جس میں — موت۔ قبر۔ برزخ۔ حشر نشر۔ قیامت۔ اعمال نامہ۔ جہنم۔ جنت وغیرہ — کی تفصیلات درج ہیں!

جلد حاصل کیجئے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑیگا!

قیمت:- (اعلیٰ ایڈیشن) دس روپے -/10 ۔ (جیبی ایڈیشن) چھ روپے -/6

ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ ۔ لاہور ۔ مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

بابُ المراسلات

سوشلزم اور قرآنی نظامِ معیشت میں بنیادی فرق

جب سے طلوعِ اسلام میں سوشلزم اور قرآن کے معاشی نظام میں فرق کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ سوشلزم کس طرح (اپنے خدا فراموشانہ فلسفۂ زندگی کی رو سے) اسلام کے نقطۂ نگاہ سے مردود اور ناقابلِ قبول ہے، اُس طبقہ کی طرف سے جس کا رجحان کمیونزم یا سوشلزم کی طرف ہے۔ ہمیں اکثر خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں۔ یہ خطوط اس حقیقت کے عکاس ہوتے ہیں۔ کہ اقبال نے اشتراکیوں کے متعلق جو ابلیس کی زبان سے کہلوایا تھا۔ کہ

یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مُو

وہ کس قدر صحیح تھا۔ یہ خطوط بے ربطگیٔ فکر اور ژولیدگیٔ ذہن کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اور اس حقیقت کے مظہر کہ جب انسان کسی کشمکش میں گرفتار ہو جائے تو پھر اس کی فکر کس قدر معکوس ہو جاتی ہے۔ ہمارے یہ نوجوان سوشلزم کے گرویدہ ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ (مسلمانوں کے معاشرہ سے کٹنا بھی نہیں چاہتے۔ اس لئے وہ چاہتے یہ ہیں کہ ان دونوں میں مفاہمت کی کوئی صورت نکل آئے۔ ان کی یہی کشمکش ہے جس سے ان کی فکر میں بے حد بے ربطی اور قلب و دماغ میں پریشانی پیدا ہو رہی ہے ــــ کس قدر قابلِ رحم ہے ان بیچاروں کی یہ "برزخی حالت" ہماری انتہائی کوشش یہ رہتی ہے کہ ہم کسی طرح ان نونہالانِ ملت کو اس کشمکش سے نجات دلا کر انہیں اس سکون و اطمینان سے آشنا کرا دیں جو وحدتِ فکر و عمل کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔

اس قسم کی پریشانیٔ فکر و نظر کا اندازہ ذیل کے خط سے ہو سکے گا جو حال ہی میں موصول ہوا ہے۔

"السلام علیکم۔ طلوعِ اسلام ستمبر ۱۹۷۰ء صفحہ ۳۵ پر تحریر فرمایا گیا ہے کہ "سوشلزم میں "سوشل" تو ٹھیک ہے لیکن "ازم" مردود ہے۔ طلوعِ اسلام اپریل ۱۹۷۰ء میں مرقوم ہے کہ سوشلزم کا معاشی نظام اسلام کے معاشی نظام کے متماثل ہے۔ لیکن اس کا فلسفۂ زندگی اسلام کے فلسفۂ زندگی کے خلاف ہے۔ اور کفر ہے۔

(۱) سوال یہ ہے کہ جب آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ فلسفۂ زندگی بنیاد ہے اور معاشی یا سیاسی نظام اس پر عمارت ہے۔ یا فلسفۂ زندگی (نظریۂ حیات) ایک درخت ہے اور عملی نظام اس کا پھل یا اسلامی اصطلاح ہیں (آپ کی تصریحات کے مطابق طلوعِ اسلام صـ۱ـ) ایمان اصل ہے اور عمل زندگی اس کی فرع۔ تو جب یہ مسلّم ہے کہ کڑوے درخت کا پھل کڑوا اور میٹھے کا میٹھا ہوتا ہے تو اسلام اور سوشلزم کے متضاد درختوں کا پھل یکساں میٹھا کیسے ہو گیا؟ اگر یہ کہا جائے کہ انسان کو آم کھانے سے غرض ہے پیڑ سے کیا غرض۔ تو جناب اس سے اتفاق کریں گے؟ اگر نہیں تو کیوں؟

(۲) کسی نظریہ کی صداقت کا معیار کیا ہے؟ قرآن حکیم کا ارشاد ہے (اور آپ کو بھی اس سے اتفاق ہے طلوعِ اسلام) "اعملوا علیٰ مکانتکم انی عامل فسوف تعلمون من تکون لہٗ عاقبۃ الدار" تو گویا کسی نظریہ کی صداقت کا معیار اس کے عملی نتائج ہیں۔ کہ آیا اس سے بنی نوع انسان کا فائدہ ہے یا نقصان۔ آپ کا یہ اعتراف کہ سوشلزم کا عملی نظام اسلام کے عملی نظام کے متماثل ہے تو پھر یہ ایک فلسفۂ زندگی حق اور ایک باطل کیسے ہو گیا؟

(۳) آخرت کی زندگی دنیا کی زندگی کا نتیجہ ہوتی ہے (اس سے بھی آپ کو اتفاق ہے) تو جب سوشلزم کی دنیوی زندگی اسلام کی دنیوی زندگی کے متماثل ہے تو آخرت کیوں نہ متماثل ہو گی؟"

آپ نے غور فرمایا کہ اس میں دلائل کس قدر رکیک اور ان سے اخذ کردہ نتائج کس قدر بعید از حقیقت ہیں۔ جو کچھ صاحبِ مکتوب کہنا چاہتے ہیں اسے ایک مثال سے سمجھئے۔

ایک قوم نہ خدا پر ایمان رکھتی ہے نہ وحی پر، نہ انسانی ذات پر، اور نہ آخرت پر، لیکن اپنے ہاں جو نظامِ حکومت قائم کرتی ہے اس میں جھوٹ، فریب، چوری، زناکاری، شراب خوری، قماربازی وغیرہ کو ممنوع قرار دیتی ہے۔ ان صاحب کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ ان کا ضابطۂ اخلاق، اسلام کے ضابطۂ اخلاق کے مماثل ہے، اس لئے ان کے نظریۂ حیات کو بھی اسلام کے نظریۂ حیات کے مماثل سمجھنا چاہیئے۔ اس دلیل کو آگے بڑھانے سے حسبِ ذیل نتائج سامنے آئیں گے:-

(۱) قرآن نے مومنین کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی ہے کہ وہ لغو باتوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ لہٰذا، جو شخص لغو باتوں سے پرہیز کرے اسے مومن قرار دینا چاہیئے۔

(۲) قرآن نے کہا ہے کہ مومن جنت میں جائیں گے اس لئے اس شخص کے متعلق، جو لغو باتوں سے اعراض برتتا ہے، یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ بھی جنت میں جائے گا کیونکہ وہ مومن ہے۔

اس دلیل کا بودہ پن واضح ہے۔

اب روس یا چین کی سوشلزم کو سامنے لائیے ۔

(۱) سوشلزم کا معاشی نظام اسلام کے معاشی نظام کے مماثل ہے۔ لیکن اس کا فلسفہ زندگی، اسلامی فلسفہ زندگی کے یکسر خلاف ہے ـــــ وہ خدا، وحی، آخرت کو تسلیم نہیں کرتے۔

اب ان صاحب کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ سوشلزم اور اسلام کے معاشی نظام میں مماثلت ہے، اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان دونوں کا فلسفہ زندگی بھی ایک جیسا ہے !

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہئے ـــــ !

(۲) قرآن کریم نے کہا ہے کہ اسلامی نظریہ حیات کی حامل قوم کی دنیاوی زندگی بھی خوشحال ہوگی، اور آخرت بھی خوشگوار۔ ان صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ چونکہ سوشلسٹ قوموں کی دنیاوی زندگی خوش حال ہوتی ہے۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی آخرت بھی خوشگوار ہوگی۔ (حالانکہ وہ آخرت کے قائل ہی نہیں!)

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے ـــــ !

قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا میں تین قسم کی قومیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) وہ قوم جس کا نظام حیات، مستقل اقدار خداوندی کے مطابق متشکل ہو، اس کی دنیا کی زندگی بھی کامرانیوں کی ہوگی اور آخرت کی زندگی بھی سرفرازیوں کی۔

(۲) وہ قوم جو صرف طبیعی زندگی کے مفادات کے لئے کوشاں ہو ۔ اسے اس کی محنت کا صلہ مل جائے گا جس سے اسے اس دنیا کی خوش حالیاں نصیب ہو جائیں گی۔ لیکن آخروی زندگی میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا ـــــ اور

(۳) وہ قوم جو نہ مستقل اقدار خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے اور نہ ہی دنیاوی ترقی کے لئے کوشاں ہو۔ وہ اس دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوگی اور اُخروی زندگی میں بھی تباہ حال۔

لہٰذا، یہ کہنا تو صحیح ہوگا کہ جو قوم اس دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہے اس کی اخروی زندگی خوشگوار نہیں ہوگی۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ جو قوم دنیاوی زندگی میں خوش حال ہے، اس کی آخرت بھی سنوری ہوتی ہوگی۔ ایسا سمجھنا قرآن کے خلاف اور فکر معکوس کی تخلیق ہوگا۔

(۳) ان کی سب سے بڑی مغالطہ آفریں دلیل یہ ہے کہ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے" ـــــ جب سوشلسٹ نظریہ زندگی کے پھل (یعنی معاشی نظام) اور اسلامی نظریہ زندگی کے پھل (یعنی معاشی نظام) باہدگر مماثل ہیں۔ تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ دونوں درخت بھی ایک جیسے ہیں۔

اسے کہتے ہیں مدعی سست گواہ چست۔ کیا آپ نے روس یا چین کے کسی سوشلسٹ کو بھی یہ کہتے سنا ہے کہ ان کے نظریہ حیات کا درخت اور اسلام کے نظریہ حیات کا درخت، ایک ہی ہیں۔ وہ اس نظریہ حیات کے درخت کو جڑ بنیاد سے اکھیڑنے کے درپے ہیں۔ اور ان کا ارشاد یہ ہے کہ دونوں درخت ایک ہی ہیں! کیونکہ ان کے پھل ایک جیسے ہیں۔

اور یہی ان صاحب کی بنیادی غلطی ہے۔ ہم نے جو پہلے مثال پیش کی ہے، اس میں سیکولر نظریہ حیات کی حامل قوم کا ضابطہ اخلاق، ان کے درخت کا پھل نہیں۔ انہوں نے یہ پھل دوسروں سے مستعار لے کر اپنے درخت میں لٹکا رکھے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو اخلاقی اقدار وقتاً فوقتاً انسانوں کو ملتی رہیں، ان میں سے اکثر اقدار نے ایک عالمگیر ضابطہ اخلاق (UNIVERSAL CODE OF ETHICS) کی شکل اختیار کر لی ہے۔ جنہیں دنیا کی مختلف قومیں فلسفہ حیات کے مختلف ہونے کے باوجود، اپنے اپنے ہاں بطور ضابطہ قوانین رائج کر لیتی ہیں۔ جیسے کہ اقوام متحدہ (U.N.O.) کے بنیادی حقوق انسانیت کے منشور کا قریب (۵۰) فیصد حصہ انہی حقوق پر مشتمل ہے، جو وحی کے ذریعے عطا ہوئے تھے، یہ ضوابط اخلاق و حقوق، ان درختوں کے پھل نہیں جو ان قوموں کے ہاں بطور نظریہ حیات ایستادہ ہیں۔ ان اقوام نے یہ پھل خارجی منڈیوں سے لے کر اپنے درختوں میں لٹکا رکھے ہیں۔ ان پھلوں کے غیر فطری ہونے کا نتیجہ ہے کہ ضوابط اخلاق کے اس قدر مشترک ہونے کے باوجود اقوام عالم میں اس قدر باہمی تصادم و تزاحم ہے۔

ہماری سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ دین کا نظام اتنے طویل عرصہ سے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ کہ یہ بات ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتی کہ ایمان اور اعمال کا باہمی رشتہ کیا ہے۔ اور غلط ایمان کا نتیجہ صحیح اعمال ہو ہی نہیں سکتے۔ (ایمان سے مراد نظریہ زندگی یا فلسفہ حیات ہے)۔ اگر آپ کہیں دیکھیں کہ ایمان تو غلط ہے لیکن عمل صحیح ہے، تو سمجھ لیجئے کہ یہ مصنوعی عمل تقلیم (GRAFTING) کا نتیجہ ہے۔ اساسی درخت کا پھل نہیں۔

اور یہ بات بالکل واضح ہے۔ ایک شخص ایک ایسے نظام سے متمسک ہے، جو نہ خدا پر ایمان رکھتا ہے، نہ وحی کی راہنمائی پر۔ نہ انسانی ذات کو تسلیم کرتا ہے، نہ حیات آخرت کو۔ اس کے سامنے ایک ایسا موقع آجاتا ہے کہ وہ اگر ذرا سا جھوٹ بول دے تو اسے لاکھوں روپے مفت میں حاصل ہو جاتے ہیں۔ جھوٹ کی شکل یہ ہے، کہ وہ نہ سوسائٹی کے نوٹس میں آسکتا ہے۔ اور نہ ملک کی عدلیہ کی مشینری کی گرفت میں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کونسا جذبہ محرکہ ہے جس کی بنا پر یہ شخص اس وقت جھوٹ نہ بولے اور دیانتداری سے کام لے۔ وہ ایسا کیوں کرے؟ دنیا کا کوئی فلسفہ اس کیوں کا جواب آج تک نہیں دے سکا۔ اور نہ ہی دے سکتا ہے، اس جذبہ محرکہ کا فقدان ہے

کہ تمام اقوام عالم کے ہاں اس قسم کے ضوابط اخلاق و قوانین موجود ہیں، لیکن جھوٹ، فریب، بددیانتی عام ہوتی چلی جارہی ہے، اور ذی حساس دانشوروں کی ہزار آہ و فغاں، اور ارباب سیاست کے تدبر کی لاکھ فسوں کاری کے باوجود اس کی روک تھام کا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا۔

اب آئیے سوشلزم کی طرف۔ سوشلزم کے معاشی نظام کا پہلا حصہ یہ ہے، کہ وسائل پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت میں نہ رہیں۔ بلکہ مملکت کی تحویل میں آجائیں۔ اس نظام کا یہ حصہ قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے لیکن یہ تو صرف منفیانہ پہلو ہے، اور ظاہر ہے کہ محض اس منفیانہ تبدیلی سے سوشلزم کا نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کا مثبت حصہ اس سے آگے آتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ:-

> ہر شخص اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق جان مار کر محنت کرے۔ لیکن اپنی محنت کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر باقی سب دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دے۔

سوال یہ ہے کہ کونسا جذبہ محرکہ ہے، جس کی بنا پر ایک شخص اس کے لئے آمادہ ہو جائے، اور آمادہ بھی صرف ایک وقت کے لئے نہیں، بلکہ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرے۔ یہ چیز خود اس کی زندگی کا تقاضا بن جائے، اس سوال کا جواب مارکس سے لے کر ماؤزے تنگ تک کوئی نہیں دے سکا۔ زیادہ سے زیادہ کہا گیا ہے تو یہ کہ ـــ یہ کچھ تاریخی وجوب کی رو سے ہوگا۔ تاریخی وجوب ایک مبہم اور بسیط اصطلاح ہے، جس کا کوئی مفہوم متعین نہیں لیکن اسی تاریخی وجوب کی اندھی قوت کا تقاضا یہ بھی بتایا جاتا ہے۔ کہ اگر وہ آج نظام سرمایہ داری کو الٹ کر اس کی جگہ سوشلسٹ نظام قائم کرے گی۔ تو اس کے بعد وہ اس نظام کو الٹ کر اس کی ضد نظام قائم کردیگی انسان کی مرضی اور ارادے کو نہ پہلی تبدیلی میں کوئی دخل ہوگا۔ اور نہ دوسری میں ـــــ آپ نے غور فرمایا، کہ اس تاریخی وجوب کے نظریہ کی رو سے صاحبِ اختیار و ارادہ انسان کو کس قدر مجبورِ محض بنا کر رکھ دیا گیا ہے، کہ وہ ان انقلابات کے سیلابوں کو امڈتا دیکھے۔ اور نہ صرف یہ کہ ان کے خلاف کچھ نہ کر سکے، خس و خاشاک کی طرح ان میں بہے چلا جائے۔

سوچئے کہ کیا اس قسم کا نظریہ حیات انسان کے اندر ایسی تبدیلی پیدا کر سکتا ہے کہ وہ جان مار کر محنت کرے، اور اپنی کم از کم ضروریات سے زائد سب کچھ دوسروں کے لئے دے دے؟ یہ تبدیلی تو بہت بڑی ہے۔ سوشلسٹ ممالک کے افراد میں تو ابھی تک عام سطح کی قلبی تبدیلی بھی پیدا نہیں ہوئی۔ مثال کو لیجئے ایک سوشلسٹ ملک ہے۔ "روزنامہ مساوات" لاہور کی یکم ستمبر ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں وہاں کے "عظیم رہنما کم ال سنگ" کا ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا تھا۔ جس میں انہوں نے سرکردہ ماہرین معیشت اور دانشوروں کے سوالات کا جواب دیا

تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا کہ:۔

"سوشلسٹ معاشرہ میں ابھی تمام لوگوں میں اجتماعیت کا جذبہ اس حد تک بلند نہیں ہوا کہ وہ سرکاری املاک کو اپنی املاک کی طرح عزیز جان سکیں۔ اور ان کی ذمہ دارانہ دیکھ بھال کر سکیں"

ان ممالک میں ابھی تک غیر سرکاری منڈیاں بھی موجود ہیں جہاں کاشت کار اپنی اجناس کو فروخت کر سکتے ہیں۔ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ اس ثنویت سے (یعنی سرکاری منڈیوں اور غیر سرکاری منڈیوں کی موجودگی) سے نظام معیشت کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ مسٹر ننگ نے کہا۔

"اگر اس مفروضے کی بنیاد پر کہ جز وقتی پیداوار اور کاشت کار منڈی کا وجود منتزکہ معیشت کے لئے نقصان دہ اور خود غرضی کو ہوا دینے کا سبب ہے کاشت کار منڈی کو قانوناً ختم کر دیا جائے، تو پھر کیا ہوگا۔ گو اس طرح منڈی کا بازار تو ضرور ختم ہو جائے گا۔ لیکن چور بازاری بدستور باقی رہے گی۔ کاشت کار چپکے چپکے دوسروں کے عقبی دروازوں پر دستک دیں گے اور اپنی جز وقتی پیداوار کی مرغیوں اور انڈوں کو فروخت کرنے کے لئے چور دروازے تلاش کریں گے ......

یاد رہے کہ جو چیزیں عوام کی مانگ پورا نہیں کرتیں، اگر حکومت ان کی یکساں قیمتیں مقرر بھی کر دے، تب بھی ان چیزوں کی چور بازاری ہوتی ہے اور یہ کاشت کار منڈی میں فروخت ہوتی ہیں۔ اکثر اوقات یوں ہوتا ہے کہ کچھ لوگ سرکاری دکانوں سے چیزیں خرید کر ان کا ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ اور جب دوسروں کو ان چیزوں کی انتہائی سخت ضرورت ہوتی ہے تو وہ انہیں دوبارہ گراں قیمتوں پر فروخت کرتے ہیں .... انڈوں کی سرکاری قیمتوں اور کاشت کار منڈی کی قیمتوں کے درمیان فرق ہے۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سرکاری دکانوں سے انڈے خرید کر انہیں دوبارہ منڈی میں فروخت کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے"

یہ شہادت ہے ایک بہت بڑے سوشلسٹ ملک کے عظیم سوشلسٹ راہنما کی۔ آپ نے دیکھا کہ سوشلزم کے پچاس سالہ عملی تجربہ کے باوجود وہاں کے لوگوں کی ذہنیت بعینہٖ وہی ہے، جو نظام سرمایہ داری کے تابع رہنے

والے لوگوں کی ہوتی ہے۔ اور ان میں بھی ابھی تک وہی خرابیاں موجود ہیں جنہیں نظام سرمایہ داری کی تخلیق کہا جاتا ہے یہ خرابیاں نہ تو نظام سرمایہ داری کی تخلیق ہیں اور نہ ہی ان کا علاج سوشلزم کے خدا فراموشانہ نظام سے ہو سکتا ہے اقبال نے جب روس سے کہا تھا کہ تمہارے ہاں وہ اساسِ محکم موجود نہیں جو اس قسم کے عظیم معاشی انقلاب کا بار اٹھا سکے تو اس سے اس کی مراد یہی تھی، اور یہی وہ اصل ہے، جسے ہم بھی کئی برسوں سے مسلسل دہرا رہے ہیں سوشلزم کے نظریۂ حیات کے درخت میں اس قسم کے پھل لگ ہی نہیں سکتے، انہوں نے ببول کے درخت کے کانٹوں کے ساتھ آم لٹکا دیئے تھے۔ یہ آم نہ ببول کے درخت کے پیدا کردہ تھے، نہ ببول میں کبھی آم لگ سکتے ہیں، روس میں یہ مصنوعی آم خشک ہو رہے ہیں۔ باقی سوشلسٹ ممالک میں بھی رفتہ رفتہ ایسا ہی ہو جائے گا۔

یہ اساسِ محکم قرآنی ایمان مہیا کر سکتا ہے۔ اس ایمان یا نظریۂ حیات کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسانی زندگی اس کی طبیعی زندگی ہی نہیں۔ اس کے علاوہ اس میں ایک چیز اور بھی ہے، جسے انسانی ذات کہتے ہیں اس ذات کی نشوونما انسانی سعی و کاوش کا مقصود ہے۔ یہ نشوونما خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار پر عمل پیرا ہونے سے ہو سکتی ہے۔ اس طرح کی نشوونما یافتہ ذات، موت کے بعد زندگی کی مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ ان اقدار میں ایک بنیادی قدر یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی محنت کی کمائی میں سے جس قدر دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دیتا ہے، اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہو جاتی ہے۔ یہ ہے وہ تخمِ صالحہ جس سے اسلامی نظام کا شجرِ طیب بڑھتا، پھولتا اور پھلتا ہے، اور اس میں فطری طور پر قرآن کے معاشی نظام کا پھل لگتا ہے۔ یہ ہے بنیادی فرق سوشلزم کے معاشی نظام اور قرآن کے معاشی نظام میں۔ قرآن کا معاشی نظام معاشیات تک ہی محدود نہیں، یہ انسانی زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام نہ تو سوشلزم کی جگہ "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح اختیار کرنے سے عمل میں آ سکتا ہے، اور نہ ہی مساواتِ محمدیؐ وغیرہ قسم کے مقدس الفاظ کے تعویذوں سے، اس کے لئے لاینفک شرط یہ ہے کہ مسلسل تعلیم و تربیت سے لوگوں کے دلوں میں یہ ایمان پیدا کیا جائے، جب یہ ایمان پیدا ہو جائے گا۔ تو اس کا فطری نتیجہ اس قسم کا معاشی نظام ہوگا۔ غیر مسلم قوموں کے ہاں تو اس قسم کے ایمان کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن آج مسلمانوں میں بھی یہ ایمان موجود نہیں، جس طرح ہم نے سوشلزم کے ساتھ "اسلامی" کا اضافہ کر دیا ہے، اسی طرح ہمارے ہاں پیدا ہونے والے بچے کا اسلامی نام رکھ کر یہ سمجھ لیا جاتا ہے، کہ وہ اس قسم کے ایمان کا حامل ہو گیا ہے۔ یہ ہماری بنیادی غلط فہمی ہے، اس قسم کے ایمان (یعنی قلبی اور ذہنی تبدیلی) کے بغیر ہم زیادہ سے زیادہ، سوشلزم کی منفی منزل طے کر سکتے ہیں — یعنی ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیت سے چھین کر مملکت کی تحویل میں دے سکتے ہیں — لیکن اس کا مثبت پہلو کبھی وجود میں نہیں آ سکتا۔ جب وہ اس ایمان کے بغیر، پچاس سال کی تگ و تاز کے باوجود سوشلسٹ ملکوں کے ہاں قائم نہیں ہو سکا، تو ہمارے ہاں کس طرح قائم ہو جائیگا۔

اور یہی وجہ ہے کہ ہم ان لوگوں کی بھی مخالفت کرتے ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ شرعی قوانین کے نفاذ سے قوم کی اخلاقی برائیاں دور ہو جائیں گی۔ قوانین کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں، انہیں میکنکی طور پر نافذ کرنے سے اخلاقی برائیاں دور نہیں ہوا کرتیں ۔۔۔ اس سے صرف کھلے دروازے، چور دروازوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس کی بیّن مثال سعودی عرب کی مملکت ہے (دیکھئے ہی کر وہاں) شرعی قوانین تمام و کمال نافذ ہیں۔ لیکن ان سے وہاں کے عربوں کی ذہنیت اور کردار میں کس قدر تبدیلی واقع ہوئی ہے، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یاد رکھئے، قرآن کریم نے قوموں کے حالات کی تبدیلی کے لئے ان کی نفسیاتی تبدیلی کو لازمی شرط قرار دیا ہے، اور نفسیاتی تبدیلی نہ تو شرعی قوانین کے میکانکی نفاذ سے پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ہی سیاسی ایجی ٹیشنوں سے، یہ پیدا ہوتی ہے کتاب و حکمت کی صحیح تعلیم و تربیت سے ۔

بعض گوشوں سے یہ بھی کہا گیا ہے، کہ کسی زمانے میں تو اسلام اس قسم کا نظام قائم کر سکا تھا۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد اس کی یہ صلاحیت ختم ہو گئی، اور اب وہ ایسے نظام کے قیام کا موجب نہیں بن سکتا۔ اس اعتراض کا الزامی جواب تو یہ ہے کہ اگر حقیقت یہی ہے جو آپ بیان کرتے ہیں تو پھر آپ نے سوشلزم کے ساتھ اسلامی کی چیپی کیوں لگائی ہے۔ کیا (آپ کے نظریہ کے مطابق) چلے ہوئے بم کا یہ اس قدر وزنی خول جسے آپ سوشلزم کی گردن میں لٹکا رہے ہیں۔ اپنے ساتھ اسے بھی نہیں لے ڈوبے گا؟

اور اس کا مثبت جواب یہ ہے کہ کسی درخت کو سرسبز و شاداب رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے خارجی تخریبی اثرات سے بھی محفوظ رکھا جائے، اور سامان نشو و نما بھی بہم پہنچاتے رہیں۔ جب تک ایسا ہوتا رہا، اسلام کا شجرِ طیّب اپنے پھل دیتا رہا۔ جب مسلمانوں نے ایسا کرنا چھوڑ دیا۔ تو وہ درخت سوکھ گیا۔ قرآن نے ایمان کے ساتھ عمل کی شرط کو ناگزیر قرار دیا ہے، تو اس سے یہی مراد ہے۔

لیکن اُس درخت کا تخم صالح اب بھی قرآن کے اندر اُسی طرح موجود ہے، یا یوں کہیے کہ اس کی جڑیں ابھی تک تر و تازہ ہیں، اگر انہیں از سر نو سامانِ نشو و نما دیا جائے، تو یہ پھر اُسی قسم کا شجر طیب بن سکتا ہے اور اسی قسم کے پھل لا سکتا ہے ۔۔۔ اور اس شجر طیب کے علاوہ دنیا کا کوئی اور درخت بھی ایسے پھل نہیں لا سکتا، یہ خدا کا دعویٰ ہے اور اس کے دعویٰ کے محکم ہونے میں کیسے شبہ ہو سکتا ہے! ۔۔۔ اور اسی بنا پر ہم یہ کہتے ہیں کہ آپ نظام سرمایہ داری کو ضرور ختم کر دیں (کہ اس نے اب انسانیت کو تباہ کر رکھا ہے)۔ اور اس کی جگہ پر امن طریق سے اپنا نظام لاؤ، لیکن اسے اسلامی نظام نہ کہو۔ یہ نظام اسلامی اُس وقت کہلا سکے گا جب اس کی عمارت خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار کی پیدا کردہ قلب و نگاہ کی تبدیلی کی بنیادوں پر استوار ہو گی اور اس کا دائرہ زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہو گا ۔۔۔ معترضہ: اگر کوئی مسلمان (جس طرح کے ہم مسلمان ہیں اسی طرح کا مسلمان) سوشلزم کے معاشی نظام کو اپناتا ہے، لیکن خدا، وحی، اور آخرت سے انکار نہیں کرتا۔ تو محض اس بنا پر کہ اس نے سوشلزم کے معاشی نظام کو اپنایا ہے اسے دائرہ اسلام سے خارج نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس سے وہ ویسا ہی مسلمان رہیگا جیسے دوسرے مسلمان ہیں

حقائق و عبر

۱- امام مالکؒ کے مناقب

لاہور سے ایک ماہنامہ شائع ہوتا ہے — ترجمان الحدیث — اس کے مدیر ہیں (مولانا) احسان الٰہی ظہیر ایم۔ اے، ایم۔ او۔ ایل، فاضل مدینہ یونیورسٹی - مجلس ادارت میں شریک ہیں پروفیسر محمد اکبر ایم اے بشیر احمد انصاری، ایم۔ اے، حافظ ثناء اللہ ایم۔ اے۔ اور مجلس مشاورت حسب ذیل زعماء پر مشتمل ہے۔

شیخ التفسیر مولانا محمد عبدہٗ۔ شیخ الحدیث مولانا محمد عبداللہ - ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ایم۔ اے۔ ڈی لٹ ڈاکٹر احسان الٰہی رانا - ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی - اور پروفیسر عبدالقیوم ایم۔ اے۔

اس ماہنامہ کی اگست ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں، پروفیسر بشیر احمد (ایم۔ اے) کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ جس کا عنوان ہے — امام مالکؒ — اس میں لکھا ہے کہ "بعض کتب سیر میں آپ کے مناقب کے ضمن میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے جس سے آپ کے علم وفضل پر روشنی پڑتی ہے" اور وہ واقعہ (جسے ہم قارئین طلوعِ اسلام کے حسنِ ذوق سے صد معذرت، اور ان کے احساسِ حیا سے ہزار ہزار ندامت کے ساتھ درج کرنے کی اجازت چاہتے ہیں) حسب ذیل ہے:-

مدینہ میں ایک معتبر اور پارسا عورت رہتی تھی۔ جب اس کی وفات ہوئی، اور غسالہ اسے غسل دینے لگی۔ تو اس نے اس نیک بی بی کی شرمگاہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ کہ عورت تو پرلے درجے کی زانیہ اور فاحشہ تھی، غسالہ کا یہ کہنا تھا کہ اس کا ہاتھ وہیں چپک کر رہ گیا۔ اور بہت کوشش کے باوجود جدا نہ ہوا۔ اس عورت کے وارث علماء اور فقہاء کے پاس بھاگے۔ لیکن کوئی بھی شخص خاطر خواہ جواب دے سکا آخر وہ امام مالکؒ کے پاس آئے۔ اور تمام ماجرا بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ غسالہ نے ایک نیک عورت پر تہمت لگائی ہے اس لئے غسالہ پر حد قذف خاص کی جائے۔ یعنی اس کو تہمت لگانے کی سزا اسّی درّے دی جائے، جب غسالہ کو اسّی درے لگائے گئے۔ تو ہاتھ خود الگ ہو گیا۔ اس واقعہ کا بہت دور دور تک چرچا ہوا کیونکہ اس سے آپ کی علمی بصیرت اور فقہی اجتہاد پر قدرت رکھنے کا پتہ چلتا تھا۔"

واقعہ آپ نے پڑھ لیا۔ اس کے بعد آپ صرف ایک بار ایک نظر پھران ڈگریوں پر ڈال لیجئے۔ جو مندرجہ بالا فہرست میں لاؤڈ سپیکروں کی طرح آویزاں ہیں۔

۲۔ سب کچھ جانتے بوجھتے

جریدہ ایشیا (لاہور) کی ۱۱۔ اکتوبر کی اشاعت میں، ڈاکٹر الٰہی علوی صاحب، سابق کونسلر آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "اسلامی آئین اور قائداعظم"۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں جو ۱۹۴۳ء میں کراچی میں منعقد ہوا تھا (اور جس میں ڈاکٹر علوی صاحب خود شریک تھے) ایک قرارداد منظور ہوئی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ

> پاکستان میں جو آئین ہوگا وہ قرآن و سنت کے مطابق ہوگا اور رائج الوقت قوانین میں جلد سے جلد شریعت کے مطابق تبدیلی کی جائے گی۔

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ اس تجویز کی موافقت میں متعدد تقاریر ہوئیں، اور اس کی مخالفت میں کوئی ایک آواز بھی نہ اٹھی۔ خود قائداعظم نے اس کے حق میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ۔۔۔

> جہاں تک اس تجویز کا تعلق ہے وہ ہر مسلمان کے دل کی پکار ہے، اور قرارداد پاکستان کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ مسلم لیگ کا مشن اور پاکستان کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ پاکستان میں اللہ کے دین کا نظام قائم ہو۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کے بعد لکھا ہے کہ وہ (اس اجلاس کے بعد) مودودی صاحب سے ملنے سرنا (دارالاسلام) گئے۔ اور ان سے اس اجلاس کی کارروائی اور قرارداد کا تذکرہ کیا۔ اور

> مولانا سے عرض کیا کہ لیگ کے قائد اور ممبران کا یہ میلان دیکھتے ہوئے مسلمانوں کے لئے اب آپ کا مشورہ کیا ہے۔ مولانا نے فرمایا۔ کہ مسلم لیگ میں اس رجحان کو تقویت دینے کے لئے مخلص اور دیندار لوگوں کا اس میں رہنا نہایت ضروری ہے۔

یہ ۱۹۴۳ء کا واقعہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد

(۱) مودودی صاحب خود مسلم لیگ میں شریک ہو گئے؟ اگر نہیں ہوئے تو کیوں!

(۲) کیا انہوں نے اپنی جماعت کے اراکین کو مشورہ دیا کہ وہ مسلم لیگ میں شریک ہو جائیں۔ ظاہر ہے۔ کہ ان میں کچھ تو "مخلص اور دیندار" ہونگے ہی؟

(۳) کیا مودودی صاحب نے اپنی کسی تحریر یا تقریر میں، مسلم لیگ کی اس قرارداد کا تذکرہ کیا یا عام مسلمانوں

کو مشورہ دیا کہ وہ مسلم لیگ میں شریک ہو جائیں۔

اس کے برعکس کیا یہ واقعہ نہیں کہ

(۱) مودودی صاحب بدستور مسلم لیگ اور اس کے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کرتے رہے؟ حتیٰ کہ

(۲) انہوں نے فروری ۱۹۴۶ء کے ترجمان القرآن میں لکھا کہ "جنت احمقاں میں بسنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں۔ لیکن آزاد پاکستان (اگر فی الواقع وہ بنا بھی تو) لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا" ——— اور

(۳) اپریل ۱۹۴۷ء میں جب ان کی جماعت کے ایک اجلاس (منعقدہ ٹونک) میں ان کی جماعت کے بعض افراد نے مسلم لیگ میں شمولیت کے متعلق سوال کیا۔ تو انہوں نے کہا کہ "جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں۔ تو پھر کس منہ سے ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دے"!

حالانکہ جب اسی قسم کی قرارداد، پاکستان کی مجلس دستورساز نے پاس کی (جسے قرارداد مقاصد کہا جاتا ہے) تو مودودی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ اس سے یہ مملکت مسلمان ہو گئی ہے۔ یعنی مملکتِ پاکستان تو اس قرارداد سے مسلمان ہو گئی۔ لیکن تحریک پاکستان اس قسم کی قرارداد کے باوجود غیر اسلامی کی غیر اسلامی رہی۔

اور اس کے ساتھ ہی مودودی صاحب بھی (اپنے ہم نواؤں کی نگاہ میں بدستور "امام احمد بن حنبلؒ" اور امام ابن تیمیہؒ" کے ہم پایہ رہے!!

اے ذر تو خدا نئی، ولیکن ——— ستار العیوبی و قاضی الحاجاتی

۳۔ ووٹ کی قیمت ——— حرام کو حلال طیّب قرار دیدیا گیا

جماعت اسلامی کے نقیب "ایشیا" کی ۲۵۔ اکتوبر کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ لاہور کے ——— ایک سو آٹھ وکیلوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کر رہے ہیں۔ اس تقریب پر مودودی صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

پاکستان کے وکلاء نے ہمیشہ اپنے فرض کو پہچانا ہے اور ہر نازک مرحلے پر وہ ملک کو بچانے کے لئے آگے بڑھے ہیں۔ انہوں نے اس ملک میں قانون کی حکمرانی اور عدل و انصاف کا نظام قائم کرنے کے لئے اپنا کردار پوری طرح ادا کیا ہے۔ میں ان وکلاء کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ جو اس موقع پر جماعت اسلامی میں شامل ہونے کا فیصلہ کر رہے ہیں۔

اور اسی اشاعت میں "ایشیا" نے اپنے مقالہ افتتاحیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ :-

تحریکِ پاکستان کے راہنماؤں میں یہ وکلا ہی تھے جنہوں نے آئینی اور قانونی جنگ لڑ کر پاکستان کے قیام کی راہ ہموار کی اور پاکستان بننے کے بعد اس کو ایک صحیح اسلامی مملکت بنایا۔ یہاں کے عوام کو ان کے انسانی حقوق سے بہرہ مند کرنا، اس ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے سے بچانا، اور مختلف فتنوں سے محفوظ کرنا بھی سب سے زیادہ وکلا ہی پر منحصر ہے۔ ان کی حیثیت وہی ہے جو کسی زمانے میں حضرات علما کی تھی۔

یہ الیکشن کے موسم کی بات ہے، لیکن اس سے پہلے، وکلا ہی نہیں، بلکہ خود پیشۂ وکالت کے متعلق مودودی صاحب کے کیا ارشادات تھے، انہیں بغور سنیئے۔ انہوں نے ایک مستفسر کے سوال کے جواب میں فرمایا تھا۔

> وکالت کو آپ تو خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ قانونِ الٰہی کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے پیشہ میں کچھ حرام کی آمیزش ہو تو وہ بہرحال بغاوت سے تو کچھ کم درجہ میں گناہ ہے۔ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت، مزدوری، پرائیویٹ فرموں کی ملازمتیں اور اسی قسم کے دوسرے پیشوں میں ایسی صورتیں ہم پہنچ سکتی ہیں۔ جن کے اندر کم از کم ناگزیر معصیت کی حد پر آدمی قائم کر سکتا ہے۔ اور وہ کم از کم اس حد میں تو حرام نہیں جس درجہ کی یہ وکیلانہ بغاوت حرام ہے — (ترجمان القرآن - فروری ۱۹۴۲ء)

اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ "وکیل کے محرر کا کام بھی حرام ہے۔" اور "اس کے ہاں کھانے پینے سے بھی پرہیز کرنا چاہیئے۔"

مودودی صاحب نے وکلا حضرات کو مبارک باد پیش کی ہے، کہ وہ ان کی جماعت میں شامل ہو گئے ان کی ہم نوائی میں ہم بھی وکلا حضرات کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ کہ (وقتی طور پر ہی سہی) ان کی کمائی حرام سے حلال تو ہو گئی! اب الیکشن کے بعد دیکھیئے فتویٰ کا رخ کس طرف مڑتا ہے؟

مودودی صاحب نے اپنے اسی جواب میں "زنانِ بازاری کے کسب" کو بھی حرام قرار دیا تھا۔ لیکن ووٹ تو ان کے بھی ہیں! دیکھیئے، ان کے لئے شریعت مودودی کی "کتاب الحیل" سے کیا برآمد ہوتا ہے — پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ۔

۴۔ اظہارِ تشکر

عسکری حکومت نے ایک کام بالیقین ایسا کیا ہے۔ جس کے لئے نہ صرف موجودہ ملتِ پاکستانیہ، بلکہ

اس کی آنے والی نسلیں بھی اس کی شکر گزار رہیں گی۔ اس حکومت نے انتخابات منعقد کرنے کے فیصلہ کے بعد ملک کی مختلف سیاسی پارٹیوں کو جو کھلی چھٹی دی ہے۔ تو اس سے ہمارے یہ لیڈران کرام" جو اتنے عرصہ سے قوم کی مرفہ الحالی اور ملک کی بہبودی، بلکہ اسلام کی سرفرازی کا نقاب اوڑھ کر قوم کو مسلسل دھوکا دے رہے تھے۔ اس بری طرح سے ننگے ہوئے ہیں کہ ساری دنیا ان کے اس رقص برہنہ کا تماشا دیکھ رہی ہے۔ اور قوم ان کی اصل و حقیقت سے خوب آگاہ ہوئی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ بے نقاب جماعت اسلامی ہوتی ہے، کیونکہ وہی سب سے زیادہ دبیز اور مقدس پردوں میں چھپی ہوتی سامنے آئی تھی۔ اس سے پہلے ان لوگوں کی ٹیکنیک یہ تھی۔ کہ یہ اپنے سے باہر کسی کو اپنا ہدف بنا کر، قوم کو تالیاں بجانے کے لئے اس کے پیچھے لگا دیتے تھے۔ عسکری حکومت کے اس فیصلہ سے اب ان کے سامنے کوئی خارجی ہدف نہیں رہا۔ اس لئے یہ باہمدگر گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ اور اس میں ان کے نقاب ہی نہیں پھٹ رہے، کپڑوں تک اتر رہے ہیں۔

اور یہ سب کچھ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے ہو رہا ہے۔ انہوں نے اتنے عرصہ تک جو قوم اور ملک کو اس قدر ذلیل، اور خدا کے دین کو اس قدر بدنام کیا تھا۔ تو خدا کے قانون مکافات نے انہیں اس قدر رسوا اور ذلیل کیا ہے کہ باید و شاید۔

پرویز صاحب کا درس قرآن کریم

لاہور میں محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم — ہر اتوار

صبح ۹½ بجے

بمقام ۲۵ - بی - گلبرگ ۲ لاہور میں ہوتا ہے

خواتین کے لئے پردہ کا انتظام ہوتا ہے۔

ناظم

پیپلز پارٹی کا انتخابی منشور
(قرآن کے آئینے میں)

ایک طویل عرصے کے انتظار کے بعد پیپلز پارٹی نے بھی بالآخر اپنا انتخابی منشور شائع کر دیا۔ اس وقت ہمارے سامنے اس کا وہ متن ہے، جو نصرت (لاہور) کی ۱۵ تا ۲۲ نومبر کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ ہم اس کا قرآن کریم کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔

۲۔ کسی تمہید و تعارف کے بغیر منشور کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"پاکستان پیپلز پارٹی کا یہ اعلان کہ:

اسلام ہمارا دین ہے۔

جمہوریت ہماری سیاست ہے۔

سوشلزم ہماری معیشت ہے۔

طاقت کے مالک عوام ہیں۔

پارٹی کے نظریہ کی پوری وضاحت کر دیتا ہے اور اس منشور میں پارٹی کا جو پروگرام پیش کیا گیا ہے۔ اس سب پر محیط ہے"

شروع شروع میں اس پارٹی کی طرف سے یہ اعلان ہوا کرتا تھا۔ کہ

اسلام ہمارا مذہب ہے۔

جمہوریت ہماری سیاست ہے۔

سوشلزم ہماری معیشت ہے۔

یہ اعلان، سیکولر نظامِ حکومت کے عین مطابق تھا۔ جس میں مذہب کا دائرہ چند ایک معتقدات اور رسوم پرستش تک محدود ہوتا ہے۔ اور زندگی کے عملی معاملات کا حل اپنے طور پر سوچا جاتا ہے۔ جب اس پر اعتراضات ہوئے تو انہوں نے "مذہب" کی جگہ "دین" کہنا شروع کر دیا۔ لیکن باقی شقیں بدستور رہیں، اور اس طرح یہ

فارمولا، مذاق بن کر رہ گیا۔ ہم نے اس زمانے میں کہا تھا، کہ قرآنی نقطۂ نگاہ سے کہنا یوں چاہیئے کہ

اسلام ہمارا دین ہے۔ جس کی رُو سے، معاشرت، سیاست، معیشت غرضیکہ نظامِ حیات کے تمام گوشے ان حدود کے اندر رہتے ہیں۔ جو قرآن کریم نے متعین کی ہیں، یہی ہمارا نصب العین ہے ـــــ

۳۔ ان کے موجودہ فارمولا میں ایک اور شق کا اضافہ ہوا ہے۔ یعنی یہ کہ طاقت کے مالک عوام ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے، طاقت (یعنی اقتدارِ اعلیٰ) کے مالک نہ عوام ہوتے ہیں، نہ خواص، نہ افراد ہوتے ہیں نہ قوم، طاقت اس قانون کو حاصل ہوتی ہے جو کتاب اللہ کے مطابق مرتب کیا جائے۔ اگر کسی قوم کے اکیاون فیصد تو ایک طرف، سو فی صد افراد بھی کوئی ایسا قانون وضع کریں جو قرآن کے خلاف ہے، تو اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس کی وقعت پرکاہ جتنی بھی نہیں ہوگی۔ لہٰذا منشور کی یہ شق۔ قرآنی تصورِ حکومت کے خلاف ہے۔ اس حکومت میں لاحکم الا للّٰہ۔ اور لاغالب الّا ھو " طاقت " کا بنیادی اصول ہے۔

۴۔ منشور میں کہا گیا ہے، کہ

پارٹی کے پروگرام، مطالبات اور سرگرمیوں کی روح اسلام کی تعلیمات کے تابع ہے۔ پارٹی ایسا کوئی قانون برداشت نہیں کرے گی، جو اسلام اور قرآن کی تعلیمات کے منافی ہو۔ پارٹی کی مثبت تجاویز، اسلام کے احکام کی روح اور اصولوں سے اخذ کی گئی ہیں۔

ان الفاظ کے انتخاب میں بڑی چابکدستی سے کام لیا گیا ہے۔ عصرِ حاضر کی کامیاب سیاست اسے کہا جاتا ہے جس میں کوئی بات متعین طور پر کہہ کر اپنے آپ کو (COMMIT) نہ کیا جائے ـــــ مندرجہ بالا الفاظ اسی انداز سیاست کے صحیح آئینہ دار ہیں۔ مثلاً کل کو اگر پارٹی کے کسی پروگرام۔ مطالبہ یا سرگرمی پر اعتراض کیا جائے، تو اس کے جواب میں کہا جا سکے گا۔ کہ آپ اس پروگرام، مطالبہ یا سرگرمی کی محسوس شکل کی طرف نہ دیکھئے۔ اس کی " روح " پر نگاہ رکھئے۔

اسی طرح اگر پارٹی کے کسی فیصلہ یا اقدام کے متعلق کہا جائیگا کہ وہ اسلام کے فلاں حکم کے خلاف ہے تو جواب میں کہا جا سکے گا کہ آپ اسلام کے حکم کے الفاظ کی طرف نہ جائیے۔ اس کی "روح" کو پیش نظر رکھئے کہ یہی بات ہم نے اپنے منشور میں کہی تھی۔ منشور کے ان الفاظ میں کافی تفسیر بلکہ تاویل کی گنجائش رکھ لی گئی ہے۔

پھر اس میں ایک چیز اور بھی قابل غور ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ " پارٹی ایسا کوئی قانون برداشت نہیں کرے گی جو اسلام اور قرآن کی تعلیمات کے منافی ہو۔

جب ۱۹۵۶ء کے آئین میں یہ لکھا گیا کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا۔ جو "اسلام" کے خلاف

ہوا۔ اس پر اعتراض کیا گیا کہ یہ اصطلاح (اسلام) بڑی مبہم ہے۔ اس کی جو تعبیر کوئی چاہے کر لی جائے گی۔ اس کی جگہ "کتاب و سنت" کے الفاظ رکھے جائیں۔ چنانچہ ایک ترمیم کی رو سے اس میں یہ الفاظ رکھ دیئے گئے۔

اب انہی مودودی صاحب نے جنہوں نے ۱۹۶۲ء کے آئین میں "اسلام" کی جگہ "کتاب و سنت" کے الفاظ درج کرائے تھے، یہ کہہ دیا کہ وہ الفاظ تو محض عوام کے بہلانے کے لئے رکھ دیئے گئے تھے۔ کتاب و سنت کی رو سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی کہلا سکے، ملک میں حنفی ضابطۂ قوانین نافذ ہونا چاہیئے۔ اس پر مختلف فرقوں کی طرف سے جو بحث چل رہی ہے، اس کا تذکرہ طلوعِ اسلام کے صفحات میں کیا جا چکا ہے (اور کیا جا رہا ہے) اس سلسلہ میں پیپلز پارٹی کے ترجمان روزنامہ مساوات کی ۳ ستمبر ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں ایک مقالہ افتتاحیہ سپردِ قلم کیا گیا تھا جس کا عنوان تھا — مولانا مودودی کی ملتِ محرومہ(؟) پر تازہ ضربیں — اس میں لکھا گیا تھا کہ

> اسلامی حکومت سے مراد وہ حکومت ہے، جس کا نقشہ سرورِ کائنات نے پیش کیا تھا۔ اگر کسی شخص کو — مزاج شناسِ رسول — کا القاب قبول کرنے کا حوصلہ ہے تو اس کو چاہیئے کہ وہ اپنے طرزِ فکر کو حضورؐ کے طرزِ فکر پر ڈھالنے کی سعی کرے اور سوچے کہ اگر حضورؐ کے زمانے میں ملت ان حالات سے دوچار ہوتی، تو وہ کونسا راستہ اختیار کرتے۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ قرآن کی طرف رجوع کا حکم دیتے جس میں کسی شخص کے لئے کسی اختلاف کی گنجائش نہیں، کیونکہ حکم اور قانون اللہ کے ہیں اور کسی کی مجال نہیں کہ دم مار سکے۔

یہ پڑھ کر ہماری زبان پر بے ساختہ آیا تھا کہ الحمد للہ! — دیدہ ام مرتسے دریں قحط الرجال۔ اور مدیرِ مساوات (محترم حنیف رامے) کے لئے دل سے دعائیں نکلی تھیں۔ قرآن کو قانون کی اساس قرار دینے سے نہ صرف یہ کہ توحید ثابت کا اقرار و اعلان ہو جاتا ہے بلکہ بات بالکل واضح اور متعین ہو جاتی ہے، اس سے ہمیں یہ امید بندھی تھی۔ کہ پیپلز پارٹی کے منشور میں غالباً یہ شق آ جائے گی۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جہاں پارٹی میں ایسے افراد تھے جو قرآن خالص کی رو سے قانون کی اساس کو متعین رکھنا چاہتے تھے۔ وہاں ایسے عناصر بھی تھے جو اپنے آپ کو اس طرح پابند نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ (بنا بر مصلحت) اسلام سے وابستگی کا اعلان بھی کرنا چاہتے تھے، بنا بریں انکی خواہش تھی کہ منشور میں "اسلام" کی مبہم اصطلاح شامل کی جائے۔ منشور مرتب کرنے والوں نے ان دونوں متخالف گروہوں میں مفاہمت کی شکل یوں پیدا کر دی کہ منشور میں لکھ دیا۔ کہ کوئی قانون "اسلام اور قرآن" کے خلاف نہیں ہوگا — اس نے ان متحارب فریقوں کو تو راضی کر لیا۔ لیکن "اسلام اور قرآن" کہہ کر جہالت کا ایسا نمونہ پیش کیا جس کی مثال کہیں نہ ملے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام اور قرآن دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ یا للعجب!

۵ — منشور کے سرنامہ پر دین - اسلام - قرآن کے الفاظ (صفحہ ۸۳) کی طرح لکھنے کے بعد باقی منشور میں کسی ایک

مگر بھی ان الفاظ کو نہیں لایا گیا۔ سارا منشور، سوشلزم کی تشریحات پر مبنی ہے، جن میں چین کے ڈھانچہ کا زیادہ تتبع کیا گیا ہے، اور عبوری دور میں، تدریجی پروگرام کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس دور سے گزرنے کے بعد، جب یہ پروگرام تکمیل تک پہنچے گا۔ تو اس کا نقشہ چین کے سوشلسٹ نظام کا سا ہوگا۔ چنانچہ منشور میں اسلامی نظام یا اسلامی معاشرت وغیرہ اصطلاحات کے بجائے سوشلسٹ اصلاحات، سوشلسٹ نظام، سوشلسٹ سماج وغیرہ اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس باب میں، یہ منشور دوسری پارٹیوں کے منشور کے مقابلہ میں زیادہ "دیانتدارانہ" ہے۔ کہ اس میں بات واضح طور پر کہی گئی ہے ۔۔۔ اگر اس کے سرنامہ میں، دین ۔ اسلام ۔ یا اسلام اور قرآن جیسی اصطلاحات نہ بھی جاتیں تو اور بھی اچھا ہوتا۔ پھر اس دیانت میں مصلحت کی آمیزش نہ رہتی۔

۶۔ قوموں کی زندگی میں نئی نسل کی تعلیم کا مسئلہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جو قوم یا مملکت کسی خاص نظریہ کی حامل ہو، اس کے ہاں یہ سوال اور بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ زیرنظر منشور میں تعلیم کے سلسلہ میں کہا گیا ہے

> تعلیم کے میدان میں منتہائے مقصود، از سرنو متعین کرنا ہوگا۔ تعلیم کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ نوجوان نسل کو اپنے گرد و پیش کی دنیا سے باخبر ہونے کے قابل بنانا ہی ضروری نہیں، بلکہ اس کو تبدیل کرنے کے قابل بنانا بھی ضروری ہے، انہیں سماجی تبدیلی کی نوعیت اور تاریخ کے لمحوں کا بھی گہرا علم ہونا چاہیئے، انہیں قدرت کے نظر آنے والے عملوں کے اسرار سمجھنے اور منکشف کرنے کے لئے ضروری سائنسی آلات سے ہی لیس نہیں ہونا چاہئے بلکہ ان میں اتنی دیانت اور جرأت بھی ہونی چاہیئے۔ کہ وہ حقیقت اور سچائی کو اسی طرح قبول کرلیں جس طرح وہ ان کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک صحیح معنوں میں غیر طبقاتی سماج کو وجود میں لانے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ طالبان علم کی نظر پورے سماج پر محیط ہو۔[۱]

ایک سیکولر مملکت میں نظام تعلیم اسی نہج کا ہوتا ہے، اسلامی مملکت میں نظام تعلیم طالب علموں کے سامنے، حق اور باطل کے پرکھنے کا ایک خاص معیار (مبنی بر وحی) پیش کرتا ہے اور ان کے قلب و دماغ کو اسی قالب میں ڈھالتا ہے۔ ان کے قلب و دماغ کی یہی وہ تبدیلی ہے جس کی رو سے وہ دنیاوی نظاموں کو بدلتے ہیں کسی موجودہ نظام کا بدل دینا فی ذاتہٖ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بدلنے کے معنی یہ ہیں کہ غلط کو صحیح سے بدلا جائے۔ اور قرآن کی رو سے ایسی تبدیلی وحی کی راہ نمائی کے بغیر ناممکن ہے۔

۷۔۔۔ انتخابی نظام کی اصلاح کے سلسلہ میں منشور میں کہا گیا ہے کہ

> پارلیمنٹ میں مالدار اور صاحب جائیداد طبقہ کو غلبہ دلانے کے لئے موجودہ انتخابی نظام سے بہتر طریقہ وضع نہیں کیا جا سکتا۔ الیکشن لڑنے پر بھاری رقم خرچ ہوتی ہے جو غریب امیدوار اس وقت تک خرچ

---

[۱] معلوم ہوتا ہے کہ اصل منشور انگریزی زبان میں مرتب کیا گیا تھا۔ اور زیر نظر متن اس کا اردو ترجمہ ہے۔

نہیں کرسکتا۔ جب تک اسے مالدار سرپرستوں کی امداد حاصل نہ ہو۔ یہاں تک کہ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی سیاسی جماعتوں کو بھی مفاد پرستوں سے مالی رعایت حاصل کرنے یا معقول مالی وسائل رکھنے والے اشخاص کو ٹکٹ دینے کے خطرہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

اس کی اصلاح کے لئے تجویز یہ کیا گیا ہے کہ:-

انفرادی امیدواروں کے بجائے پارٹی لسٹ کی بنیاد پر انتخاب کا طریقہ رائج کیا جائے گا۔

ان سے کوئی پوچھے کہ کیا پارٹیوں کو اپنے وجود، استحکام، پراپیگنڈہ وغیرہ کے لئے مالدار سرپرستوں کی امداد کی ضرورت نہیں پڑتی؟ ان کے اس قدر وسیع اخراجات مالداروں کی اعانت کے بغیر پورے کہاں سے ہو سکتے ہیں؟

انتخابات کے سلسلہ میں طلوع اسلام نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ملک میں، آمدنی کے لحاظ سے نشستوں کے حلقے بنائے جائیں۔ اور اسی لحاظ سے نشستوں کی تعداد مقرر کی جائے۔ پھر ہر حلقہ میں امیدوار بھی وہی ہو جس کی اتنی آمدنی ہو اور اسے ووٹ بھی وہی دیں جو اس قدر آمدنی والے ہوں۔ اس سے ملک کی حکومت میں غریبوں کی صحیح نمائندگی ہو سکے گی۔ ہماری اس تجویز کی مخالفت سرمایہ پرستوں کی طرف سے تو ہونی تھی۔ سو ہوئی۔ ہمیں توقع تھی کہ کم از کم پیپلز پارٹی اسے خوش آمدید کہے گی۔ لیکن اس نے بھی اسے درخور اعتنا نہ سمجھا اور موجودہ انتخابات بھی اسی سرمایہ دارانہ طریق سے لڑنے اور آئندہ کے لئے بھی اسی طریق کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا — سچ کہا تھا اقبال نے کہ:-

طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

۸ — ہمیں توقع تھی کہ اس انتخابی منشور میں اتنا تو ضرور کہا گیا ہوگا کہ

مملکت تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کی

ذمہ دار ہوگی

لیکن متعین طور پر اس میں یہ بھی نہیں کہا گیا۔ زرعی اقدامات کے سلسلہ میں صرف اتنا کہا گیا ہے۔ کہ

نیم بے روزگاری ملکی معیشت پر بہت بڑا بوجھ ہے۔ نیم بے روزگاروں اور بے روزگاروں کو ہر حال پہننے کے لئے لباس، رہنے کو مکان، اور ہر صورت میں خوراک بہم پہنچانا ضروری ہے۔

"بہم پہنچانا ضروری ہے" کے الفاظ تو ہر پارٹی دہراتی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار بھی اس ضرورت سے انکار نہیں کرتے، سوال یہ ہے کہ کیا کوئی نظام ایسا بھی ہے جو یہ کہے کہ ان ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے۔ اور اگر ہم اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہو سکیں، تو انفرادی طور پر ہر محروم کو اس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ مملکت کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے، اور اجتماعی طور پر قوم کو اس کا حق ہوگا کہ وہ اس قسم کی

حکومت کو بدل ڈالیں۔

اس قسم کی ذمہ داری قرآنی نظام ہی اپنے سر پر لیتا ہے۔ اس وقت تک یہ ذمہ داری نہ روسی نظام نے اپنے سر پر لی ہے نہ چینی نظام نے۔ اور نہ ہی موجودہ منشور نے ایسا کہا ہے۔ اس میں بھی وہی اجرتوں، تنخواہوں اور پنشنوں کی اصلاح کا چکر چلایا گیا ہے۔ قرآنی نظام میں اجرتوں اور تنخواہوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا اساسی اصول یہ ہے کہ

ہر شخص اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق کام کرے۔ اور
مملکت ہر فرد کی ضروریات زندگی بہم پہنچائے۔

اگر بایں نہ رسیدی تمام بولہبی است

۹۔ قرآن کی رو سے، قومیت کا معیار اشتراکِ ایمان ہے نہ کہ رنگ، نسل، زبان، وطن کا اشتراک۔ اسی اصل الاصول کو "دو قومی نظریہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے جو مطالبہ پاکستان کی بنیاد ہے۔ مملکت پاکستان میں اس نظریہ کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ اس کے متعلق روزنامہ مساوات نے اپنی ۱۱ ستمبر ۱۹۷۶ء کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا تھا۔

> پاکستان اس دو قومی نظریے کی پیداوار ہے، جسے برصغیر پاک و ہند میں سراج الدولہ سے لیکر قائد اعظم محمد علی جناح تک ہمارے اکابر نے اپنے خون اور پسینے سے سینچا۔ یہ دو قومی نظریہ ہی تھا جس نے ایک ملک کو دو مختار مملکتوں میں بانٹ کر دنیا کا جغرافیہ بدل دیا۔ اور ہندوستان میں بسنے والی ایک اقلیت کو دنیا کے سب سے بڑے اسلامی ملک کا وارث بنا دیا۔
>
> پاکستان کو بجا طور پر قائد اعظم کی میراث کہا جاتا ہے، لیکن قائد اعظم کی اصل میراث وہ دو قومی نظریہ ہے جس نے پاکستان کو جنم دیا۔ اور جو خود انہیں، ٹیپو سلطان۔ سید احمد شہید۔ سید احمد خاں، محمد علی جوہر اور اقبال سے ورثے میں ملا تھا۔ آج اگر اس نظریے پر زد پڑتی ہے۔ تو گویا پاکستان کی بنیاد ڈھے جاتی اور ہماری جداگانہ قومیت کے نیچے سے زمین سرک جاتی ہے۔
>
> دو قومی نظریہ پہلے بھی ہمارے دشمنوں کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ اور آج بھی ان کے لئے سوہانِ روح بنا ہوا ہے۔ جوں جوں پاکستانی قوم اس نظریے کی معنویت سے غافل ہوتی جائے گی، ہمارے دشمنوں کا وہ خواب پورا ہوتا جائے گا۔ جو انہوں نے کل اکھنڈ بھارت کی شکل میں دیکھا تھا۔ اور آج پاک بھارت کنفیڈریشن کی صورت میں دیکھ رہے ہیں ....
>
> نظریہ پاکستان اگر کچھ ہے تو صرف دو قومی نظریہ ہے۔ اسی نظریے پر پاکستان کا مطالبہ کیا گیا۔ اور اسی پر پورے برصغیر کے مسلمانوں نے ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے پاکستان کے حصول کے لئے سرفروشانہ جدوجہد

کی، اس نظریے کے مطابق ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں، جن کا دین، تہذیب و تمدن اور طرزِ حکومت اس حد تک مختلف ہیں، کہ وہ ایک مملکت کی صورت میں زندگی نہیں گزار سکتیں"۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ ہے دو قومی نظریہ کی اہمیت، خود پیپلز پارٹی کے ترجمان کے الفاظ میں۔ لیکن زیرِ نظر منشور میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ پاکستان کے مسلم اور غیر مسلم باشندے ایک قوم کے افراد نہیں، بلکہ مسلمان اپنے دین کی اشتراک کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم کے افراد ہیں، اس کے برعکس اس میں غیر مسلم اقلیتوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ

> پاکستان کے تمام شہریوں کو مذہبی عقیدے، نسل اور رنگ کے امتیاز کے بغیر مساوی سیاسی حقوق حاصل ہوں گے، انہیں قانون کا یکساں تحفظ حاصل ہوگا۔ وہ ہر ایک عہدہ حاصل کر سکیں گے اور ملازمت کے سلسلہ میں ان کے خلاف کسی قسم کا امتیاز نہیں برتا جائے گا۔

ہم محترم مدیر مساوات سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا یہی وہ "دو قومی نظریہ" ہے، جو مملکت پاکستان کی اساس تھا؟

لیکن ہم محترم مدیر مساوات سے کیا پوچھیں۔ وہ تو کچھ ایسے شکنجے میں گرفتار نظر آتے ہیں کہ ہمیں ان کی حالت پر رحم آتا ہے۔ محترم موصوف (حنیف رامے صاحب) کے متعلق ہم اچھی رائے رکھتے ہیں ۔۔۔ وہ سلجھی ہوئی فکر کے نوجوان ہیں۔ جنہیں قرآن پاک سے بھی شغف ہے۔ اس دور میں ایسے نوجوان بہرحال مغتنمات میں سے ہیں لیکن پارٹی بازی ایسی لعنت ہے کہ اس میں انسان اگر وہ بجذبۂ عصبیت کا اس بُری طرح سے شکار ہو جاتا ہے کہ وہ زیرِ دام پھڑپھڑاتا تو ہے اس کے حلقے توڑ کر باہر نہیں نکل سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارا اندازہ غلط ہو، لیکن نصرت کی نگارشات سے کچھ ایسا ہی مترشح ہوتا ہے۔ مثلاً زیرِ نظر منشور کی اشاعت کے ساتھ ہی نصرت کے مقالۂ افتتاحیہ میں اس منشور پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس میں لکھا گیا ہے۔

> اس منشور کو ایک جملہ میں ادا کرنا ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اسلامی نیشنلزم اور اسلامی سوشلزم کے ان دو عظیم ستونوں کی تعمیر نو کا بلیو پرنٹ ہے جن پر قائداعظم نے پاکستان کی عمارت کھڑی کی تھی۔ اسلامی نیشنلزم یا دو قومی نظریہ ہی سیاسی سطح پر تحریک پاکستان کا محور اور قیام پاکستان کا سنگِ بنیاد تھا۔

یہ ہے محترم حنیف رامے صاحب کا دو قومی نظریہ کا تصور جس کی تشریح ان کے اس مقالہ افتتاحیہ میں بھی ہمارے سامنے آچکی ہے جس کے اقتباسات پہلے پیش کئے گئے ہیں۔ ان کے اس تصور کو سامنے رکھئیے، اور اس کے بعد اس سلسلہ میں جو کچھ منشور میں کہا گیا ہے، اس پر ایک نظر پھر ڈالئے اور سوچئے کہ جو کچھ منشور میں کہا گیا ہے، وہ "دو قومی نظریہ" ہے یا مسلم اور غیر مسلم کے امتزاج سے ایک متحدہ قومیت کا نظریہ۔ جسے تحریک پاکستان کے مخالفین پیش کیا کرتے تھے؟ اگر رامے صاحب پیپلز پارٹی سے وابستہ نہ ہوتے تو ظاہر ہے کہ وہ منشور میں پیش کردہ تصور

قومیت کی مخالفت میں پیش پیش ہوتے۔ لیکن بُرا ہو پارٹی عصبیت کا کہ منشور میں تو متحدہ قومیت کا نظریہ پیش کیا گیا ہے لیکن وہ اپنے اداریہ میں تاثر یہ دینا چاہتے ہیں کہ منشور میں دو قومی نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ رائے صاحب سے ہمیں (کم از کم) اس حد تک آگے چلے جانے کی توقع نہ تھی کہ وہ منشور کے سیاہ کو سفید کر کے دکھلانے کی کوشش کریں گے۔ یہ ہیں پارٹی بازی کی مجبوریاں اور وہ کشمکش جس میں رائے صاحب گرفتار ہیں۔

کس قدر حسن بھی مجبورِ کشاکش ہے کہ آہ!
سر جھکائے نہ بنے، آنکھ اٹھائے نہ بنے

رائے صاحب نے مملکتِ پاکستان کا دوسرا ستون اسلامی سوشلزم قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ

> اس پروگرام کو اسلام کے دو عظیم اصولوں پر استوار کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ سود ختم کر دیا جائے۔ دوسرا یہ کہ بیت المال قائم کر دیا جائے۔ دنیا بھر کے ماہرینِ اقتصادیات اور مسلمانوں کے نمائندہ فقہی مکاتب اس بات پر متفق ہیں کہ سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام سود پر چلتے ہیں۔ ان کے برعکس صرف ایک ہی نظام ہے جو محنت پر مبنی ہے اور سود کی نفی کرتا ہے۔ اہلِ اسلام اسے مساواتِ محمدی کا نام دیتے ہیں۔ دنیا والے اسے سوشلزم کہتے ہیں۔

رائے صاحب نے بات تو صحیح کہی ہے لیکن اس کے اظہار کے لئے جو الفاظ استعمال کئے ہیں انہیں خلطِ مبحث کا اندیشہ ہے۔ ہمارے مذہبی پیشوا (جو نظامِ سرمایہ داری کے علمبردار ہیں) قدم قدم پر یہ کہتے ہیں کہ سود حرام ہے اور بیت المال کا قیام ضروری ہے۔ یہی الفاظ رائے صاحب نے بھی استعمال کئے ہیں۔ اس سے ہماری مذہبی پیشوائیت یہ کہے گی کہ یہی کچھ ہم کہتے ہیں اور یہی کچھ یہ سوشلسٹ کہتے ہیں۔ ہم خدا اور رسولؐ کے نام کے ساتھ یہ کچھ کہتے ہیں اور یہ لوگ سوشلزم کے ملحدانہ نظریات کے مطابق یہ کچھ کہتے ہیں۔ سو مسلمان خود فیصلہ کر لیں کہ کس کا دعوےٰ مطابقِ اسلام ہے۔

رائے صاحب کو چاہیئے تھا کہ سود کے بجائے ربٰو کی قرآنی اصطلاح استعمال کرتے اور اس کے بعد بتاتے کہ ربٰو کے معنی ہیں سرمایہ کا معاوضہ، خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ اس سے مزارعت، مضاربت، کرایہ، پٹہ وغیرہ کی تمام شکلیں ممنوع قرار پا جاتیں اور یوں مذہبی پیشوائیت کے حرام کردہ سود اور قرآنی ربٰو کا فرق نکھر کر سامنے آ جاتا۔ رائے صاحب نے یہ تو کہا ہے کہ "اسلامی نظام محنت پر مبنی ہے اور سود کی نفی کرتا ہے" لیکن اس سے بات واضح نہیں ہوتی۔ ہمارے فقہی مکاتب 'سود' کو تو بے شک حرام قرار دیتے ہیں' لیکن ربٰو کو نہیں۔

لیکن محترم رائے صاحب کی غالباً دشواری یہ تھی کہ زیرِ نظر منشور میں بھی اس قسم کی صراحت نہیں کی گئی۔

باقی رہا بیت المال، سو یہ وہی چیز تھا جسے آجکل خزانہ یا (TREASURY) کہتے ہیں۔ یعنی وہ جگہ جہاں حکومت کا مال ـــ دولت یا اجناس وغیرہ ـــ جمع کیا جاتا ہے۔ رائے صاحب نے اس مفہوم کی جس کے لئے انہوں نے اس اصطلاح کو استعمال کیا ہے، یہ کہہ کر تصریح کر دی تھی کہ اس سے مراد یہ ہے کہ رزق کے سرچشموں کو قومی ملکیت میں لے کر ملک بھر کے حاجتمندوں کی حاجتوں کو قومی خزانے سے پورا کرنے کا سامان مہیا کیا جائے۔ اس کے لئے زیادہ موزوں اصطلاح "قرآن کا معاشی نظام" ہے جو اپنی جامعیت کے اعتبار سے ہمہ گیر ہے۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ رائے صاحب، مذہب کی مروجہ اصطلاحات کا استعمال زیادہ قرینِ مصلحت سمجھتے ہیں۔ لیکن انہیں غالباً اس کا احساس نہیں کہ ان اصطلاحات کا مروجہ مفہوم ہی تو ہے جو ہمارے مروجہ اسلام کی جگہ دین کا نظام قائم کرنے کے راستے میں سب سے زیادہ وزنی سنگِ گراں بن کر حائل ہے۔ اس کے لئے ہمیں قرآنی اصطلاحات استعمال کرنی چاہئیں اور ان کا قرآنی تصور بھی زیادہ سے زیادہ عام کرنا چاہیئے۔ مثلاً رائے صاحب نے اس اداریہ کے آخر میں کہا ہے کہ اس نظام کی رو سے "ہر شخص کو اتنا خوشحال بنا دیا جائے کہ وہ زکوٰۃ دے سکے لیکن زکوٰۃ لینے والا کوئی نہ ہو"۔ اس سے زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم سامنے آتا ہے جس کی رو سے جمع شدہ دولت پر اڑھائی فیصد سالانہ دے دینے سے اسلام کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ زکوٰۃ کا یہی تصور ہے جسے نظامِ سرمایہ داری کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے۔ قرآن کی رو سے، زکوٰۃ کے معنی ہیں "سامانِ نشوونما مہیا کرنا" اور اسے حکومت کا فریضہ قرار دیا گیا ہے (ملاحظہ ہو ۲۲/۴۱)۔ اس تصور کی رو سے ایسی صورت پیدا ہی نہیں ہو سکتی کہ "ہر شخص زکوٰۃ دے سکے لیکن زکوٰۃ لینے والا کوئی نہ ہو"۔ جب اسلامی نظام میں دولت جمع ہی نہیں کی جا سکتی تو اس میں مروجہ زکوٰۃ دینے والوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے اس کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم جب قرآن کا معاشی نظام پیش کریں تو اس کے لئے ایک تو غیر قرآنی اصطلاحات کبھی استعمال نہیں کرنی چاہئیں۔ اور قرآنی اصطلاحات استعمال کی جائیں تو ان کا قرآنی مفہوم واضح کر دینا چاہیئے۔ اسی سے "الفرقان" کی کیفیت پیدا ہو گی ـــ یعنی دو متضاد تصورات کو نکھار کر اور ابھار کر الگ الگ کر دینا۔

(۰)

بات پیپلز پارٹی کے انتخابی منشور کی ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس منشور کو قرآنی نقطۂ نگاہ سے اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ قرآن کی رو سے اسلامی منشور تو وہی کہلا سکے گا جو (قائد اعظم کے الفاظ میں) اس امر کا دو ٹوک اعلان کرے کہ

ہماری آزادی اور پابندی کی حدود خدا کی کتاب متعین کرے گی۔ اور
ہماری حکومت قرآنی احکام و قوانین کے نفاذ کی ایجنسی ہوگی۔ اور بس۔

لیکن ان معنوں میں تو کسی پارٹی کا منشور بھی اسلامی نہیں کہلا سکتا۔ لہٰذا دینی نقطۂ نگاہ سے سب منشور ایک جیسے ہیں۔ لیکن پیپلز پارٹی کا منشور کم از کم دنیاوی نقطۂ نظر سے باقیوں کے مقابلے میں بہتر ہے۔ ان میں سے ہر منشور کا عملی نتیجہ سیکولر نظامِ حکومت ہوگا۔ لیکن جہاں باقی منشوروں کا نتیجہ "خسر الدنیا والآخرۃ" (دنیا اور آخرت دونوں کی تباہی) ہوگا، زیرِ نظر منشور کم از کم دنیاوی مفاد کے حصول کی واضح تجاویز تو پیش کرتا ہے۔ امید ہے انہیں آئینی طور پر بروئے کار لایا جائے گا، سوشلزم کے طریقے سے نہیں۔

انسانی مسائل کے حل میں

عقلِ انسانی آج تک کن کن ارتقائی مراحل سے گزری اور اس نے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائیں۔
تاریخِ انسانی کی یہ عبرت آموز تفصیل آپ کو

پرویز صاحب کی مشہور کتاب

انسان نے کیا سوچا؟

میں ملے گی!

ہزاروں کتابوں کا نچوڑ۔ افلاطونِ اعظم سے لیکر آج تک گزشتہ اڑھائی ہزار سال میں دنیا کے چوٹی کے مفکرین، مؤرخین اور علمائے اخلاقیات و عمرانیات اور ماہرینِ معاشیات و سیاسیات نے کیا سوچا؟ — اسے پڑھیئے اور سوچیئے کہ وحی کی روشنی سے روگرداں اور محروم ہو کر نوعِ انسانی نے اپنے لئے کیا جہنم خرید لیا!

قیمت
بارہ روپے

ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵/بی ۔ گلبرگ ۲ لاہور

طلوعِ اسلام کنونشن

محترم محمد اسلم صاحب

تحریکِ طلوعِ اسلام کا تعارف

انسانی تاریخ کا یہ ایک عجیب سا تضاد نظر آتا ہے کہ جو آواز لوگوں کو خدا کی طرف بلانے کے لئے اٹھتی ہے اسکی مخالفت سب سے پہلے ان لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے جو اپنے آپ کو خداپرست کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی طرف بلانے کی دعوت سے مراد یہ ہوتی ہے کہ انسان کو قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے علاوہ دنیا کی ہر محکومیت سے آزاد کرا دیا جاتا ہے۔ اور خداپرستوں کا مقصدِ حیات یہ ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو اپنا محکوم بنایا اور رکھا جائے۔ قرآنِ مجید اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انبیاء کرام کی دعوت کی مخالفت ہمیشہ مذہب پرست طبقہ کیطرف سے ہوئی جس کا پشت پناہ سرمایہ دار طبقہ ہوتا ہے۔ اور انبیاء کرام کا مشن ان قوتوں کو شکست دے کر انسانوں کو ان کی محکومی کی لعنت سے آزاد کرانا تھا۔ حضور نبی اکرمؐ کے عہد ہمایوں میں یہ کشمکش بھی اپنی انتہا تک پہنچی اور اس کے بعد خدا کی حکومیت کا نظام بھی اپنی انتہائی آب و تاب کے ساتھ متمکن ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد پھر انہی مخالف قوتوں نے سر اٹھایا اور یہ نظام آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ تیرہ سو سال کے بعد یہ آواز ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر اقبالؒ کی زبان سے بلند ہوئی اور قائد اعظمؒ اسے عملی شکل دینے کے لئے میدان میں آ گئے۔ تاریخ نے اپنے آپ کو پھر دہرایا اور مذہبی پیشوائیت اس کی مخالفت میں پوری شد و مد سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ قائد اعظمؒ، انگریز اور ہندو کے محاذ کو نہایت عمدگی سے سنبھال سکتے تھے لیکن وہ حضرات جو قال اللہ اور قال الرسولؐ کے نعروں کے ساتھ مخالفت کے لئے ابھرے تھے، ان کے مقابلے کے لئے انہیں کسی معاون کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے ان کی نگہ انتخاب ایک ایسے نوجوان پر پڑی جو ایک مدت سے انہی وادیوں میں مصروفِ تحقیق تھا۔ اس نوجوان کا نام جو اس وقت حکومتِ ہند کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھا اور آج قرآن کریم کے حقائق کے سلسلہ میں اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے غلام احمد پرویز تھا۔ اور یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے ۱۹۳۸ء میں طلوعِ اسلام کا اجرا ہوا۔ اس میدان میں اس کے مد مقابل قبا اور عمامہ کے بڑے بڑے علمبردار تھے جن کی علمیت اور فضیلت کا سکہ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ بیرونِ ہند تک کے لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا ـــــ مولانا ابوالکلام آزاد، حسین احمد مدنی،

احمد سعید دہلوی، مفتی کفایت اللہ وغیرہم نیشنلسٹ علماء، مجلس احرار، سرخ پوش، جمعیت الانصار، جماعت اسلامی، اور ان کے ہمنوا — یہ سب تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں متحدہ محاذ قائم کئے ہوئے تھے اور ان کے مقابلہ میں یکہ و تنہا طلوع اسلام۔ اس نے مخالفتوں کے اس ہجوم کا پامردی سے مقابلہ کیا اور انہیں ہر مقام پر جس بری طرح سے شکست دی اس کی زندہ شہادت طلوع اسلام کے اس زمانے کے فائل ہیں۔

للہ الحمد کہ وہاں یہ معرکہ حسن و خوبی سر ہوا اور پاکستان وجود میں آگیا۔ یہاں آنے کے بعد طلوع اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز جنوری ۱۹۴۸ء کو ہوا اور یہ بہ توفیق ایزدی، تمام مخالفتوں سے ٹکراتا ہوا اور ہر قسم کی آلودگی سے دامن بچاتا اپنے ارتقائی منازل طے کرتا، آگے بڑھتا جا رہا ہے۔

عزیزانِ محترم! تقلید کی روش بڑی آرام دہ، سہولت بخش اور خوش آئند ہوتی ہے۔ اس کے لئے نہ علم کی ضرورت ہے نہ فکر کی، نہ کچھ محنت درکار ہوتی ہے نہ کاوش، عوام کے مروجہ عقاید اور متوارث اعمال و رسوم خواہ وہ کسی قسم کے ہوں، آپ ان کی تائید کیجئے پوری قوم آپ کے ساتھ ہوگی۔ آپ اپنے زورِ بیان سے ان عقاید و رسوم کی مدح و ستائش میں قصائد لکھتے ہیں یا ان کے بے مثل و بے نظیر ہونے پر کتابیں تصنیف کرتے ہیں تو آپ قوم کے محبوب لیڈر، عالم بے بدل، دنیا کے سب سے بڑے مفکر اور اسلام کے بہت بڑے محسن قرار پاتے ہیں۔ اس کے لئے آپ کو صرف کرنا یہ ہوگا کہ جو بات یا مسئلہ آپ کے سامنے آئے اس کے متعلق یہ بتا دیں کہ فلاں کتاب میں اس کے متعلق یہ لکھا ہے اور فلاں امام صاحب نے اس کی بابت یہ بتایا ہے۔ پھر جو شخص اس کے برعکس کچھ کہے اسے بہت بڑے فتنے کا بانی قرار دے کر اس کے خلاف "جہاد" کا فتویٰ صادر فرما دیں۔ بس اس کے بعد آپ کی پرستش ہوگی، جلوس نکلیں گے۔ اس قسم کی خدمتِ دین کے سلسلے میں لاکھوں روپے آپ کے قدموں میں ڈھیر کر دیئے جائیں گے جس کے بل بوتے پر سینکڑوں لکھنے اور بولنے والے آپ کے ہمنوا ہوں گے۔ آپ کو ان ہمنواؤں کی رفاقت اور عوام کے اتباع سے بہت بڑی طاقت حاصل ہوگی۔ اس طاقت کے زور پر آپ جو جی میں آئے منوا سکیں گے۔ یہ ہے تقلید کی روش کا ایک پہلو، اور اس کے بظاہر نفع بخش نتائج۔

اس کے برعکس دوسری روش تحقیق کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہاں جس قدر مروجہ عقائد اور متوارث اعمال و رسوم موجود ہیں انہیں ایک ایک کر کے پرکھا جائے۔ ان میں سے جو صحیح ثابت ہوں انہیں اختیار کیا جائے اور جو غلط نکلیں انہیں چھوڑ دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ایک مسلمان محقق کے لئے تحقیق و تنقید کی میزان صرف خدا کی کتاب ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ وہی حق و باطل کا معیار ہے۔ اسی سے غلط اور صحیح میں امتیاز ہو سکتا ہے۔ وہی یہ بتا سکتی ہے کہ دین کا کونسا نظام اللہ نے تجویز کیا ہے اور کون کون سی باتیں ایسی ہیں جو اس میں بعد ازاں باہر سے انسانوں نے شامل کر دی ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کی تحقیق کے لئے علم و فکر کی بھی ضرورت ہوگی اور محنت و کاوش بھی درکار۔ اس لئے کہ اس میں

ہر غلط کی علیٰ وجہ البصیرت تردید کرنی ہوگی اور اپنے ہر دعویٰ کی تائید میں خدائی سند پیش کرنی پڑے گی۔ جب آپ اس تحقیق کے بعد ان غیر قرآنی عقاید و اعمال کے خلاف آواز اٹھائیں گے جو عوام میں متوارث چلے آرہے ہیں تو اس کی سخت مخالفت ہوگی۔ ہر طرف سے آپ پر الزام تراشیاں شروع ہوجائیں گی تکفیر کے فتوے ڈھالے جائیں گے۔ نہ کوئی آپ کا ساتھی ہوگا نہ ہمنوا۔ آپ کو اپنے مقدور کے مطابق تنہا یہ جنگ انسانوں کے خود ساختہ مذہب کے خلاف لڑنی پڑے گی اور اپنا ہر "ذاتی" اور اضافی متاع کو اس کی نذر کر دینا ہوگا۔ پرویز صاحب نے یہاں اگر قرآنِ کریم کی روشنی میں یہی روش اختیار کی ہیں اس مختصر سے وقت میں انہی کے الفاظ میں بتانا چاہتا ہوں کہ ان کا پیغام کیا ہے اور اس کی علم کیا۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ

"کائنات میں ہر شے اپنی ارتقائی منزل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جو شے کسی سبب سے آگے بڑھنے سے رک جاتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وہ قانونِ ارتقاء ہے جس کی رُو سے زندہ وہی رہتا ہے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو، آگے وہی بڑھ سکتا ہے جس میں آگے بڑھنے کی استعداد ہو۔ یعنی وہ نوع جو کشمکشِ حیات میں نامساعد قوتوں سے نبرد آزما ہو کر انہیں شکست دے اور یوں اپنے زندہ رہنے کا ثبوت فراہم کرے وہ زندہ رہتی ہے جو ایسا نہ کرے وہ مٹ جاتی ہے۔ آفاقی دنیا کی طرح انسانی دنیا میں بھی یہی قانونِ ارتقاء جاری و ساری ہے۔ انسانیت کا ارتقاء علم و دانش کی راہ سے ہوتا ہے۔ ہر نئی نسل کے سامنے اس کے ماحول کے موانع و مشکلات ہوتی ہیں جنہیں سر کر لینے سے وہ نسل آگے بڑھتی ہے۔ اسی کا نام تخلیقِ مقاصد ہے۔ زندگی نام ہی تخلیقِ مقاصد کا ہے۔ مقاصد کی تخلیق جدتِ فکر و ندرتِ خیال کی رہینِ ہوتی ہے۔ اگر کسی قوم میں فکر کی تازگی باقی نہ رہے، اس کے قوائے فکریہ معطل ہو جائیں تو وہ قوم تخلیق کی اہل نہیں رہتی۔ لہٰذا وہ قابلِ نمو (DYNAMIC) اور زندہ یا نامیاتی (ORGANIC) ہونے کے بجائے مٹی اور پتھر کا ڈھیر بن کے رہ جاتی ہے اور مٹی اور پتھر سے جہانِ نو کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔"

محترم پرویز صاحب کی پکار یہ ہے کہ "میرا ایمان ہے اور میں اسی ایمان کے سہارے زندہ ہوں کہ اگر آج بھی قرآن سے ان توبرتو پردوں کو الگ کر دیا جائے جو انسانی تصورات نے اس پر ڈال رکھے ہیں اور سیرتِ محمدیہ کو ان حشو و زوائد سے پاک کر دیا جائے جو ہماری ناعاقبت اندیشیوں اور غلط عقیدت مندیوں نے اس ذاتِ اقدس و اعظم کی طرف منسوب کر رکھے ہیں تو اندھیرے میں بھٹکنے والی انسانیت اب بھی زندگی کی اس متوازن و ہموار راہ پر لگ سکتی ہے جو اُسے سیدھی شادابیوں اور کامرانیوں کی جنت کی طرف لے جانے والی ہے۔ اس لئے کہ قرآن کا مقصود انسانیت سازی ہے جس کا مشہود پیکر ذاتِ محمدی ہے (لیکن وہی پیکر جسے قرآن نے پیش کیا ہے) جب تک دنیا اس مقام تک نہیں پہنچ جاتی شرف و مزیت کی فیروز مندیاں اس کے حصے میں نہیں آسکتیں اور اس مقام تک پہنچنا اسی صورت میں ممکن ہے کہ قرآن اور سیرتِ صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) دنیا کے سامنے اپنی اصل شکل میں آجائے۔"

پرویز صاحب کہتے ہیں کہ "قرآنِ کریم کا صحیح استعمال کیا ہے؟ اس کے لئے صرف اس قدر سمجھ لینا کافی ہے کہ یہ تمام نوعِ انسانی کے لئے ضابطۂ زندگی ہے۔ اس ضابطہ کو پڑھا اس لئے جاتا ہے کہ سمجھ میں آجائے۔ اور سمجھا اسلئے جاتا ہے کہ زندگی اس کے مطابق بسر کی جائے لیکن اگر نسخہ کے انوکھے استعمال کی طرح اس ضابطۂ زندگی کو بازوں سے باندھ لیا جائے، گلے میں لٹکا لیا جائے، گھول گھول کر پینا شروع کر دیا جائے۔ اس کے الفاظ و حروف کی گنتی شروع کی جائے اور توقع یہ کی جائے کہ جو فوز و فلاح اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ ہے، وہ بھی اس انوکھے مگر سہل طریقے سے ہی مل جائے تو نتیجہ سوائے خسران کے اور کیا ہوگا؟"

پرویز صاحب کہتے ہیں کہ "اسلام میں نظامِ زندگی کی بنیاد عقیدۂ توحید ہے جو ایک عبدِ مسلم کے فکر و نظر اور اعمال و احوال کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ توحید سے مفہوم یہ ہے کہ حاکمیت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے یعنی انسانوں کو (خواہ وہ ایک فرد ہو یا افراد کا مجموعہ) دوسرے انسانوں پر حکومت کرنے کا حق نہیں ہے۔ وحدتِ خالق کے عقیدہ کا دوسرا فطری نتیجہ وحدتِ خلق ہے۔ یعنی یہ عقیدہ کہ دنیا میں تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ نسل یا ملک کی تقسیم سے انسانیت کی تقسیم نہیں ہو سکتی ہے۔ اسی ایک عقیدہ سے وہ تمام اقتصادی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، عمرانی مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں جو آج انسان کے گرد مارِ پیچاں کی طرح لپٹے ہوتے ہیں اور اس کی زندگی کو جہنم بنا رہے ہیں"

پرویز صاحب کا پیغام یہ ہے کہ "وہی نظریۂ حیات، وہی اصولِ زندگی، وہی نظامِ معاشرہ دنیا میں باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے نفع رساں ہو۔ یعنی ایک تو وہ نفع رساں اور منفعت بخش ہو اور دوسرے یہ کہ اس کی منفعت بخشی کسی خاص گروہ، خاص پارٹی، خاص ملک، خاص قوم تک محدود نہ ہو بلکہ وہ ساری انسانیت کے لئے نفع رساں ہو۔ یہ ہے وہ عالمگیر اصول جس کی بنیادوں پر قرآن اپنا نظامِ زندگی استوار کرتا ہے اور یہی اصول قوموں کی زندگی کا حقیقی ضامن بن سکتا ہے۔"

حضرات! طلوعِ اسلام اس دعویٰ کا حامی ہے کہ قرآنِ کریم نوعِ انسانی کے تمام بنیادی مسائل کا اطمینان بخش حل پیش کر سکتا ہے۔ اس بنا پر اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ معاشی نظام جیسے اہم ترین مسئلہ کو اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بناتا۔ چنانچہ اس نے گزشتہ بیس پچیس سال میں اس موضوع پر ہزارہا صفحات شائع کئے۔ ان میں نظامِ سرمایہ داری کی اصل و بنیاد اور اشتراکی نظام کے فلسفہ اور معاشی نظم و نسق کا تجزیہ کر کے ان کا تقابلی مطالعہ کیا اور اس کے بعد شرح و بسط سے بتایا کہ قرآنِ کریم کون سا فلسفۂ زندگی اور اس پر متفرع کس قسم کا معاشی نظام پیش کرتا ہے اور ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے جو کچھ "اسلام" کے نام پر پیش کیا جاتا ہے اس کی اصل و حقیقت کیا ہے۔ جو حضرات قرآنِ کریم کے معاشی نظام کی تفصیلات دیکھنا چاہیں۔ وہ ادارہ

طلوعِ اسلام کی شائع کردہ دو کتابیں "نظامِ ربوبیت" اور "خدا اور سرمایہ دار" کا مطالعہ فرمالیں۔ اس وقت میں صرف چند اقتباسات پر ہی اکتفا کروں گا۔

معاشی مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے پرویز صاحب نے فرمایا "اس میں شک نہیں کہ ہمارے دور میں (معاشی) مسئلہ نے ایسی اہمیت اختیار کر رکھی ہے کہ آنے والا مؤرخ جب اس پر نگاہ ڈالے گا تو وہ اسے عصرِ معاشیات (AGE OF ECONOMICS) کے سوا کسی اور نام سے نہیں پکار سکیگا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج تہذیب، تمدن، معاشرت، سیاست، قومی مسائل اور بین الاقوامی معاملات سب کی باگ ڈور معاشیات کے ہاتھ میں ہے اس وقت دنیا عملاً دو بلاکس (BLOCKS) میں بٹی ہوتی ہے۔ ان میں کہنے کو تو خطِ امتیاز نظامِ حکومت ہے، یعنی ڈکٹیٹرشپ اور جمہوریت، لیکن درحقیقت ان میں بنیادی اختلاف نظامِ معیشت (ECONOMIC ORDER) ہی کا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ افراد ہوں یا اقوام، روٹی کے مسئلہ نے دونوں کی ناک میں نکیل ڈالی ہوتی ہے اور وہ انہیں جدھر جی چاہے کشاں کشاں لئے پھر رہا ہے"۔

"انسان نے اس مسئلہ کے لئے جب مذہب کے دروازہ پر دستک دی، مذہب سے میری مراد ہے انسانوں کا خود ساختہ مذہب تو اس نے یہ کہہ کر اپنا پیچھا چھڑا لیا کہ ہمارا مقصد، انسان کو مرنے کے بعد کی زندگی میں عذاب سے نجات دلانا ہے۔ اس دنیا کے مسائل سے ہمارا کوئی سروکار نہیں یہ مادی دنیا کثافت اور غلاظت سے بھری ہوئی ہے اس لئے خدا کے نیک بندوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسے قابلِ نفرت سمجھیں اور جہاں تک ہوسکے اس سے دور بھاگیں۔ لیکن یہ محض فریبِ نفس تھا یا فرار کی راہ اس لئے کہ انسان دنیا سے کتنی ہی دور کیوں نہ بھاگے اور اس طرح کتنا ہی بڑا ایشور کا بھگت کیوں نہ بن جائے جب تک وہ زندہ ہے کھانے پینے کا محتاج ہے۔ وہ شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں بسیرا کر سکتا ہے۔ لیکن خوراک کے مسئلے سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا وہ خواہ چوبیس گھنٹے میں ایک مرتبہ ہی کیوں نہ کھائے، کھائے بغیر گذارہ نہیں رہ سکتا بھوک رشیوں، منیوں کو بھی لگتی ہے اور پیروں فقیروں کو بھی۔ کھاتے بغیر نہ ایشور کے اوتار زندہ رہ سکتے ہیں، نہ اللہ کے مقرب۔ اس لئے (انسانوں کے خود ساختہ) "مذہب" کا یہ کہنا کہ اسے روٹی کے مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں حقیقت کو جھٹلانا اور لوگوں کو فریب دینا ہے۔ ایسے مذہب کے علمبرداروں کو روٹی کے مسئلہ سے اس لئے دلچسپی نہیں ہوتی کہ ان کی روٹی کا انتظام دوسرے لوگ کرتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے معاشی مسئلہ کو کس قدر اہمیت دی ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کہا ہے کہ جس قوم کو رزق کی فراوانی حاصل ہو، یہ سمجھو کہ اس پر خدا کا انعام ہے اور جو بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو اس پر خدا کا غضب ہے"

پرویز صاحب کا پیام یہ ہے کہ "عسرت اور زبوں حالی کسی فرد یا قوم کی زندگی کا معمول ہو جائے تو انہیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے کہ یہ خدا کے مقبول بندوں کی علامتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے زندگی ایک جوئے رواں ہے جو اس دنیا سے اس دنیا تک مسلسل چلی جاتی ہے۔ اس لئے جن اعمال کے نتائج اس زندگی میں رسوائی اور ذلت انگیز ہوں، عاقبت میں ان کے نتائج عزت بخش اور مسرت آمیز نہیں بن سکتے۔ لہٰذا یہ سمجھنے کے لئے کہ کسی قوم کی عاقبت کی زندگی کیسی ہوگی یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کی اس دنیا کی زندگی کیسی ہے۔ اگر اسے سامانِ زیست کی فراوانی نصیب نہیں، اگر وہ رزق کی تنگی کے عذاب میں ماخوذ ہے، اگر وہ اپنی روٹی کے لئے بھی دوسروں کے دروازے پر جھولی پھیلانے کے لئے مجبور ہے تو اس قوم کو عاقبت کی سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب نہیں ہو سکتیں۔"

پرویز صاحب کا پیام یہ ہے کہ "انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جائے، جو تمام نوعِ انسانی کو بھوک، خوف اور ظلم سے محفوظ رکھنے کی ضمانت دے سکے۔ اس کا نام انسانی سطح کی زندگی ہے۔ اگر افراد روٹی کی فکر سے آزاد نہ ہوں تو وہ انسانی سطح کی زندگی تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔ اس لئے ایسا معاشرہ قائم ہونا چاہیئے جو افراد کی روٹی کی فکر سے آزاد کر دے تاکہ ان کی توانائیاں اور صلاحیتیں حیوانی سطح سے بلند ہو کر زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے فارغ ہو جائیں۔ قرآنی نظامِ ربوبیت، افراد کو روٹی کی فکر سے آزاد کر کے انہیں انسانیت کی سطح پر لے جاتا ہے۔ اسلامی معاشرہ اس خدا کی ذمہ داریاں اپنے سر پر لے لیتا ہے جس کے قوانین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے وہ وجود میں آتا ہے۔ وہ تمام افراد معاشرہ سے پورے حتم و یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ (۶/۱۵۲) ہم تمہاری اور تمہاری اولاد کے رزق کی ذمہ داری لیتے ہیں۔"

پرویز صاحب کا پیام یہ ہے کہ "انسانی دنیا میں خدا کا دعویٰ رزاقیت و ربوبیت اس نظام کی رُو سے پورا ہوتا ہے جو اس کے قوانین کی بنیادوں پر خود انسانوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے۔ انسان کی دنیا میں مشیتِ خداوندی کی تکمیل انسانوں ہی کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ لہٰذا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر ایک کا رزق اللہ کے ذمے ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ نظام جو قوانینِ خداوندی کی رُو سے قائم ہو، تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل ہوتا ہے۔"

محترم پرویز صاحب کہتے ہیں کہ "یہ چیز آپ کو صرف اسی نظام میں ملے گی کہ امت کا بلند ترین فرد امیر المومنین روٹی کا ایک لقمہ اپنے منہ میں نہیں ڈال سکتا جب تک اسے پورا اطمینان نہ ہو جائے کہ جس حلقہ کی ذمہ داری اس پر عاید ہوتی ہے اس کا ادنیٰ سے ادنیٰ فرد پیٹ بھر کر سکھ کی نیند نہیں سو گیا ہے۔ آج انسان کی حالت یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ پر ضابطہ خداوندی کی بجائے اپنے خود ساختہ ضوابط کو مسلط کر رکھا ہے اور جب اس نظام کے

نتائج بھوک، افلاس، ذلت، پریشانی و بربادی کی شکل میں سامنے آتے ہیں تو اس کا الزام خدا پر دھرتا ہے اور اس کے بعد ان مصائب کا حل پھر کسی اپنے ہی متعین کردہ نظام میں تلاش کرتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ اپنے آپ کو خدا کے نظام کے حوالے کر دے تو پھر دیکھئے کہ وہ تمام مشکلات کس طرح خود بخود آسان ہو جاتی ہیں۔ نظام اپنے اوپر مسلط کر لینا طاغوتی اور نتائج تلاش کرنے ملکوتی۔ اگر کھلی ہوئی جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟"

پرویز صاحب کا پیام یہ ہے کہ "سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ ہمارا موجودہ معاشی نظام غیر قرآنی ہے بجائے اس کے کہ ہم اس کو قرآنی نظام سے بدلیں، چاہتے یہ ہیں کہ اس میں پیوند لگا کر اپنے آپ کو دھوکا دے لیں کہ یہ قرآنی ہو گیا ہے لیکن یہ پیوند اصل کے ساتھ نہیں بیٹھتا اس لئے ہم کوشش یہ کرتے ہیں کہ اس میں کچھ کتر بیونت کر کے اسے کسی نہ کسی طرح اصل کے ساتھ چپکا دیا جائے لیکن یہ کوشش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ قرآنی نظام ایک غیر منقسم وحدت ہے اس میں غیر قرآنی پیوند کبھی فٹ بیٹھ ہی نہیں سکتا۔"

پرویز صاحب کا پیام یہ ہے کہ "ہمارے زمانے میں اشتراکیت (کمیونزم) اسے ایک ایسے نظام کی طرح ڈالی ہے جو نظام سرمایہ داری کی ضد ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اشتراکی نظام اور اسلامی نظام کی بعض جزئیات کی باہمی مماثلت (یعنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہونا) فطری ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اشتراکی فلسفۂ زندگی اسلامی فلسفۂ حیات کی ضد ہے۔ "کمیونزم" خود ایک غیر فطری فلسفۂ زندگی ہے اور ظاہر ہے کہ ایک غیر فطری نظام کی تباہ کاریوں کا حل دوسرا غیر فطری نظام نہیں کر سکتا۔ غیر فطری نظام کا حل صرف فطری نظام کر سکتا ہے جسے ہم اسلامی نظام کہہ کر پکارتے ہیں۔"

پرویز صاحب کا پیام یہ ہے کہ "مادی نظریۂ حیات کی رو سے انقلاب کے لئے تشدد کے علاوہ اور کوئی ذریعہ کارگر ہو نہیں سکتا۔ لیکن قرآنی نظریۂ حیات کی رو سے احترام انسانیت، انسانی ذات پر ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ یہ ظلم و استبداد کی قوتوں کی دراز دستیوں کو روکنے کے لئے تو قوت کے استعمال کی اجازت دیتا ہے، نظریۂ زندگی کی تبدیلی کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے کہ قوت کے استعمال سے نظریہ میں تبدیلی نہیں آسکتی یہ تبدیلی یقین (CONVICTION) سے آتی ہے۔"

محترم پرویز صاحب کا اعلان یہ ہے کہ "میں اس حقیقت کو بھی واضح طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جس طرح اسلام کا فلسفۂ حیات اور نظام زندگی کمیونزم کے خلاف ہے، اسی طرح وہ مفاد پرستانہ اور سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے بھی خلاف ہے جو ہمارے دور ملوکیت کی پیداوار اور عجمی تصورات کی یادگار ہے۔" "سرمایہ دار طبقہ نے ہمیشہ دین کی مخالفت کی تھی لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے مروجہ مذہب کا سب سے بڑا حامی یہی سرمایہ دار طبقہ ہے۔ فقط یہ ایک بات کہ (سرمایہ دار طبقہ ہمارے مروجہ اسلام کی حمایت کرتا ہے) اس حقیقت کے اثبات کے

لئے دلیل محکم ہے کہ یہ اسلام بہرحال وہ دین نہیں جو خدا کی طرف سے بوساطت محمدؐ رسول اللہ دنیا کو ملا تھا۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ وہی دین ہے تو اس سے (معاذ اللہ) خدا کی یہ شہادت جھوٹی ثابت ہوتی ہے کہ "دین جہاں بھی ہوگا سرمایہ دار طبقہ اس کی مخالفت کرے گا۔" طاغوتی قوتوں کی طرف سے کسی دعوت کی مخالفت نہیں ہوتی تو سمجھ لیجئے کہ وہ دعوت حق و صداقت کی دعوت نہیں ہے خواہ اس پر خدا پرستی کے کیسے ہی جاذبِ نگاہ و نظر فریب پردے کیوں نہ ڈال دیئے گئے ہوں۔ اس لئے کہ انسانوں کے خود ساختہ نظامہائے زندگی (خواہ ان کی شکل کچھ اور نام کوئی سا کیوں نہ ہو) ان کی مفاد پرستیوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور نظامِ خداوندی نوعِ انسانی کے ربوبیتِ عامہ کے لئے وجود میں آتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کی مفاد پرستیوں اور عیش سامانیوں پر سخت زد پڑتی ہے، لہٰذا ان کی طرف سے اس نظام کی مخالفت فطری چیز ہے۔ اگر وہ اس کی مخالفت نہیں کرتے تو سمجھ لیجئے کہ یہ نظام صحیح معنوں میں نظامِ خداوندی نہیں۔ حق و صداقت اور باطل و ضلالت کی دعوتیں پرکھنے کا یہ ایک ایسا کھلا ہوا معیار ہے جس میں کہیں کوئی استثنا نظر نہیں آئے گا۔

حضرات! محترم پرویز صاحب کی کوشش یہ ہے کہ "ہم اس خطۂ زمین میں جسے ہم نے حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا تھا کہ یہاں اسلام کا صحیح نظام قائم کریں خدا کے کائناتی قانون کی رفاقت کا فریضہ سرانجام دیں تاکہ اس کے نتائج ہمارے حسابِ شمار سے برآمد ہونے شروع ہو جائیں۔ اس کا پہلا قدم یہ ہے کہ اس فکر کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے تاکہ قرآن کا جو تصورِ زندگی اتنے عرصے سے نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے وہ پھر ہمارے سامنے آ جائے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد میں نے اپنی تمام مساعی کو اسی نقطہ پر مرکوز رکھا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اس کے نتائج بڑے حوصلہ افزا ہیں۔ اب اگلا مرحلہ یہ ہے کہ پاکستان کا آئین انہی خطوط کے مطابق مرتب ہو جائے اور اس طرح کاروانِ ملت صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائے جو اسے قدم بہ قدم قرآنی نظامِ ربوبیت کی آخری منزل تک لے جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو آپ دیکھیں گے کہ غلط نظامہائے زندگی کا ستایا ہوا انسان کس طرح کشاں کشاں اس نظام کے حیات پرور سایۂ عافیت میں پناہ لینے کے لئے آتا ہے اور کس طرح یدخلون فی دین اللہ افواجا (۲/۱۱۰) کا کیف آور منظر وجہ بالیدگیٔ قلب و نظر ہو جاتا ہے۔ واشرقت الارض بنور ربھا۔ (۶۹/۳۹) زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی، کی بشارت کس طرح ایک زندہ شہادت بن کر سامنے آ جاتی ہے۔"

اعلان

ماہنامہ طلوعِ اسلام ہر ماہ کی یکم تاریخ کو حوالہ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ پرچہ نہ ملنے کی صورت میں ۱۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع پہنچ جانی چاہیئے۔ نیز خط و کتابت کرتے وقت اپنے نمبر خریداری کا حوالہ نہایت ضروری ہے۔